پریم چند کے شاہکار افسانے

مرتب

اعجاز خاور

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب

کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو

جوائن کریں

ایڈمن پینل :

محمد ثاقب ریاض: 03447227224

سدرہ طاہر: 03340120123

حسنین سیالوی: 03056406067

Imagitor

پریم چند کے شاہکار افسانے

مرتب : اعجاز خاور

HaSnain Sialvi

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

HaSnain Sialvi

دیباچہ

پریم چند ادب کے افق پر ایک باغی ادیب کے طور پر ابھرے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" 1909ء میں انگریز حکومت نے نذر آتش کر دیا۔ انہوں نے اپنی زندگی مین تقریبا" پونے دو سو کے قریب افسانے لکھے ان کے افسانوں کا موضوع معاشرہ اور معاشرے میں بسنے والے مختلف طبقات ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں وطن دوستی' انسانیت' معاشرے کی اصلاح مساوات اور روا داری کا درس دیا ہے۔ پریم چند ترقی پسند تحریک کے بھی اہم رکن ہیں۔ انہوں نے 1936ء میں ہونے والی پہلی ترقی پسند کانفرس کی صدارت کی اور اپنے خطبہ صدارت میں ادب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

"ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو' آزادی کا جذبہ ہو حسن کا جوھر ہو' تعمیر کی روح ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو' جو ہم میں حرکت' ھنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہے"

پریم چند کے انہیں خیالات کی عکاسی ان کے افسانوں میں ہوتی ہے انہوں نے

نہایت باریک بینی اور سچائی سے نچلے طبقے پر ہونے والے ظلم و ستم سے پردہ اٹھایا ہے وہ ان معصوم لوگوں کے جذبات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

زیرِ نظر دس افسانے ان کے افسانوں میں سے انتخاب ہیں۔ ان افسانوں کی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے ایم۔ اے اردو کے نصاب میں انہی دس افسانوں کو شامل کیا ہے۔

آیئے ذرا ان افسانوں کا مختصر جائزہ لیں۔

"قزاقی" ایک چھوٹے طبقے سے تعلق رکھنے والے ہرکارے کی داستان ہے اس کہانی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ غریب اور نچلے طبقے کے لوگ ظلم و ستم اور جبر کے باوجود اپنے مالک کے وفادار رہتے ہیں گو کہ قزاقی کو نوکری سے نکال دیا گیا ہے لیکن وہ اپنے مالک کے بیٹے کی محبت میں نڈھال ہے۔

"لاٹری" اس خطے کے عوام کی بھرپور عکاسی کرتا ہے جب لوگوں کو خوشیاں میسر نہیں آتیں تو وہ ان کو Fantasize کر کے انہی نا آسودہ خواہشوں اور تڑپتے ارمانوں کی تشفی کرتے رہتے ہیں۔ پانچ روپیہ والا لاٹری کا ٹکٹ اپنی جگہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن انعام نکل آنے کی آس انسان کو ہمہ وقت دلی سکون اور بہتر مستقبل کی نوید سناتی رہتی ہے۔ لیکن پھر اچانک آس اور امید کا یہ محل دھڑام سے نیچے آگرتا ہے۔

"شکوہ شکایت" ایک ایسی کہانی ہے جس میں ایک بیوی نے اپنے میاں کی بری عادتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ بیوی نے اپنے میاں کی جو جو بری عادتیں گنوائی ہیں وہ دراصل مثبت اقدار حیات ہیں۔ جنہیں زمانے کی شکست و ریخت نے منفی اقدار حیات میں بدل دیا ہے۔ جب معاشرے کے اخلاقی معیارات بدل جائیں تو برائی اچھائی لگنے لگتی ہے۔ ایسے معاشرے میں اچھی سوچ اور اچھے اخلاقی معیارات رکھنے والا انسان اپنے آپ کو Miss Fit محسوس کرتا ہے۔ بیوی کو بھی اپنے شوہر کے انہیں اخلاقی معیارات پر اعتراض ہے لیکن درون دل وہ اپنے شوہر کی گرویدہ ہے اور اس کی ان خوبیوں سے دل و جان سے محبت کرتی ہے اور کہتی ہے۔ "مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے لئے بھی جدا نہیں رہ سکتی ان سارے عیبوں کے باوجود میں ان سے پیار کرتی ہوں۔"

ہماری معاشرتی روایت ہے کہ یہاں کوئی انسان دوسرے کو کچھ اور نہ دے سکے تو مشورہ ضرور دیتا ہے اور پھر ضروری نہیں کہ وہ خود بھی اس پر عمل پیرا ہو "بڑے بھائی صاحب" بھی اس موضوع پر لکھا گیا۔ ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ بڑا بھائی بار بار چھوٹے بھائی کو پڑھنے کی نصیحت کرتا ہے کھیل کود سے منع کرتا ہے لیکن خود ہر سال فیل ہوتا رہتا ہے جبکہ چھوٹا بھائی اول درجہ میں پاس ہوتا ہے۔ آخر دونوں ایک ہی کلاس میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

قفس یا غلامی ایک ایسا ناسور ہے جو انسان کو اندر ہی اندر سے گھن کی طرح چاٹتا رہتا ہے۔ انسان اپنی انا اپنی خود داری سب کچھ بھول جاتا ہے۔ لیکن جب ظلم انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو انسان کی انا اس قفس کے حصار کو توڑ کر بغاوت پر اتر آتی ہے اور جب وہ اس حصار سے باہر نکلتا ہے تو اس پرندے کی طرح ہوتا ہے جو پنجرے سے نکل کر آسمان کی وسعتوں میں جس طرف چاہے اڑ جائے۔ ہری دھن نے بھی "خانہ دامادی" کے حصار میں دس سال اپنے جذبات اور انا کا خون کیا لیکن جب بغاوت کرنے کے بعد اس حصار سے باہر آیا تو باہر کی دنیا اس کی اپنی دنیا تھی۔ وہ جس طرف چاہے جا سکتا تھا اس کو کوئی بھی روکنے والا نہیں تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے آپ کو آزاد محسوس کیا تھا۔

"عید گاہ" نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک بچے کی ناآسودہ خواہشوں اور محرومیوں کی کہانی ہے۔ عید والے دن جب تمام بچے اچھے اچھے کپڑے پہنے جیب میں کافی رقم ڈالے میلہ دیکھنے جاتے ہیں تو یہ غریب بچہ بھی تین پیسے لے کر ان کے ہمراہ ہو جاتا ہے۔ تمام بچے اچھے اچھے کھلونے خریدتے ہیں لیکن اس کے پاس کھلونے خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ اس کی یہ احساس محرومی اس کے اندر ایک عجیب قسم کی خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور آخر تین پیسے کا دست پناہ لے کر انہیں تمام کھلونوں سے برتر ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کرتا ہے۔

"زیور کا ڈبہ" احساس گناہ کی داستان ہے۔ پرکاش اپنی بیوی کی خاطر ٹھاکر صاحب کے گھر سے زیور کا ڈبہ تو چوری کر لیتا ہے مگر قدم قدم پر ٹھاکر صاحب کی مہربانیاں اور خلوص اس کے اندر کے انسان کو جھنجھوڑتے رہتے ہیں۔ خود جب اس کی بیوی کو اس

حرکت کا پتہ چلتا ہے تو وہ بھی اس سے کھنچی کھنچی سی رہنے لگتی ہے۔ چونکہ بنیادی طور پر پرکاش ایک اچھا انسان ہے۔ اس لئے یہ تمام باتیں اس کو احساس گناہ میں مبتلا کر دیتی ہیں اور پھر یہ احساس گناہ زیور چوری کرنے کی خوشی پر پوری طرح حاوی ہو جاتا ہے لیکن جب وہ اسے واپس ٹھاکر صاحب کے گھر رکھ آتا ہے تو اس کے من کا بوجھ اتر جاتا ہے۔

"جج اکبر" ایک دایہ اور بچے کی محبت کی کہانی ہے دایہ کو گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ بچہ اس کی جدائی میں بیمار پڑ جاتا ہے۔ اور مرنے کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ دوسری طرف دایہ کا بھی بچے سے بچھڑ کر کہیں دل نہیں لگتا وہ جج کرنے نکل پڑتی ہے لیکن جب بچے کے والد کی زبانی بچے کی حالت کا پتہ چلتا ہے تو وہیں سے بھاگم بھاگ گھر پہنچتی ہے اور بچے کو گود میں اٹھا لیتی ہے۔ بچے کا مرجھایا ہوا چہرہ پھر سے کھل اٹھتا ہے۔ یہ دراصل دایہ کی لازوال قربانی ہے۔ جس نے بچے کی زندگی کو جج پر فوقیت دی۔ اس طرح اس نے جج اکبر کا ثواب پا لیا۔

"کفن" پریم چند کی شہرہ آفاق کہانی ہے یہ صرف گھیسو' مادھو یا اس کی بیوی ہی کی داستان نہیں بلکہ یہ اس معاشرے کی شکست و ریخت کی کہانی ہے۔ یہ اس طبقاتی درجہ بندی کی کہانی ہے جس نے ایک انسان کو اعلیٰ اور دوسرے کو کم تر اور نکھٹو بنا دیا ہے۔ زمانے کی دی ہوئی بے حسی نے گھیسو اور مادھو کو اس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ وہ صرف اور صرف اس لئے درد زہ سے تڑپتی ہوئی عورت کے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں کہ جب وہ مرے گی تو گاؤں والے اس کے کفن دفن کے لئے رقم دیں گے۔ جس سے چار پانچ دن اچھے گزر جائیں گے۔

مجموعی طور پر پریم چند کی تمام کہانیاں زندہ کہانیاں ہیں۔ اس نے نچلے طبقے کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہوئے صفحات پر اس طرح بکھیر دیا ہے کہ یہ لازوال داستانیں بن گئی ہیں۔ جب تک دنیا میں عدم مساوات استحصال اور طبقاتی درجہ بندی قائم ہے۔ پریم چند کی کہانیاں اسے جھنجھوڑتی رہیں گی۔

اعجاز خاور
لیکچرار شعبہ اردو

HaSnain Sialvi

HaSnain Sialvi

قزاقی

میری بچپن کی یاد داشتوں میں قزاقی ایک نہ فراموش ہونے والا شخص ہے۔ آج چالیس برس گزر گئے۔ مگر قزاقی کا تصور ابھی تک آنکھوں میں ہے میں ان دنوں اپنے والد کے ساتھ ضلع اعظم گڑھ کی ایک تحصیل میں تھا قزاقی ذات کا پارسی تھا' بڑا ہی ہمتور' بڑا ہی زندہ دل وہ روزانہ ڈاک کا تھیلا لے کر آتا۔ رات بھر رہتا اور سویرے ڈاک لے کر جاتا۔ شام کو پھر ادھر سے ڈاک لے کر آ جاتا۔ میں تمام دن بے صبری سے اس کا منتظر رہتا۔ جونہی چار بجتے' بے چین ہو کر' سڑک پر جا کر کھڑا ہو جاتا اور تھوڑی دیر میں قزاقی کندھے پر بلم رکھے اس کے گھونگھرو بجاتا دور سے دوڑتا ہوا آتا دکھائی دیتا۔ وہ سانولے رنگ کا مضبوط اور لمبے قد کا جوان تھا۔ اس کا جسم سانچے میں ایسا ڈھلا ہوا کہ چابکدست مصور بھی اس میں کوئی عیب نہ نکال سکتا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اس کے سڈول چہرے پر بہت ہی بھلی لگتی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ

اور تیز دوڑنے لگتا۔ اس کے بلم کے گھونگھرو اور زور سے بجنے لگتے اور میرا دل فرط مسرت سے زیادہ اچھلنے لگتا۔ خوشی کی امنگ میں میں بھی دوڑ جاتا اور ایک لمحہ میں قزاقی کا کندھا میرا سنگھاسن بن جاتا۔ وہ مقام میری تمناؤں کا بہشت تھا۔ بہشت والوں کو بھی شاید وہ متحرک سرور نہ ملتا ہو گا جو مجھے قزاقی کے چوڑے کندھوں پر ملتا تھا۔ دنیا میری نگاہوں میں ہیچ ہو جاتی' اور جب قزاقی مجھے اپنے کندھے پر لئے ہوئے دوڑنے لگتا تب تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا میں ہوا کے گھوڑے پر اڑا چلا جا رہا ہوں۔

قزاقی ڈاکخانہ میں پہنچتا تو پسینہ سے تر ہو جاتا لیکن آرام کرنے کی اس کی عادت نہ تھی۔ تھیلا رکھتے ہی وہ ہم لوگوں کو لے کر کسی میدان میں نکل جاتا کبھی ہمارے ساتھ کھیلتا' کبھی برہے گا کر سناتا اور کبھی کہانیاں کہتا۔ اسے چوری ڈاکہ' مار پیٹ' بھوت پریت کے صدہا قصے یاد تھے۔ میں یہ قصے سن کر حیرت آمیز سرور میں محو ہو جاتا۔ اس کے قصوں کے چور ڈاکو سچے بہادر ہوتے تھے جو امرا کو لوٹ کر غربا و مساکین کی پرورش کرتے تھے۔ مجھے ان سے نفرت کے بجائے عقیدت ہوتی تھی!

ایک روز قزاقی کو ڈاک کا تھیلا لے کر آنے میں دیر ہو گئی۔ آفتاب غروب ہو گیا اور وہ نظر نہ آیا۔ میں کھویا ہوا سا سڑک پر دور دور تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا مگر وہ مانوس صورت نہ نظر آتی تھی۔ کان لگا کر سنتا تھا مگر "چھن چھن" کی وہ مسرت افزا آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ روشنی کے ساتھ میری امید بھی غائب ہوتی جاتی تھی۔ ادھر سے کسی کو آتے دیکھتا تو پوچھتا -- قزاقی آتا ہے؟ مگر یا تو کوئی سنتا ہی نہ تھا یا صرف سر ہلا دیتا تھا۔

دفعتاً "جھن جھن" کی آواز کانوں میں آئی۔ مجھے اندھیرے میں چاروں طرف بھوت ہی بھوت نظر آتے تھے' حتےٰ کہ والدہ کے کمرے میں طاق پر رکھی ہوئی مٹھائی بھی اندھیرا ہونے پر میرے لئے قابل ترک ہو جاتی تھی۔ مگر وہ آواز سنتے ہی میں اس طرف زور سے دوڑا۔ ہاں وہ قزاقی ہی تھا! اسے دیکھتے ہی میری بے قراری غصہ میں

تبدیل ہو گئی میں اسے مارنے لگا پھر روٹھ کر الگ کھڑا ہو گیا۔

قزاقی نے ہنس کر کہا — مارو گے تو میں ایک چیز لایا ہوں وہ نہ دوں گا۔

میں نے ہمت کر کے کہا — جاؤ نہ دینا' میں لوں گا ہی نہیں قزاقی۔ ابھی دکھا دوں تو دوڑ کر گودی میں اٹھا لو گے۔

میں نے پگھل کر کہا — اچھا دکھا دو۔

قزاقی۔ تو آ کر میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ' بھاگ چلو ۔ آج بہت دیر ہو گئی۔ بابو جی بگڑ رہے ہوں گے۔ میں نے اکڑ کر کہا۔ پہلے دکھا دو۔

میری فتح ہوئی۔ اگر قزاقی کو دیر کا خوف نہ ہوتا اور ایک منٹ بھی زیادہ ٹھہر سکتا تو شاید پانسہ پلٹ جاتا۔ اس نے کوئی چیز دکھلائی جسے وہ ایک ہاتھ سے سینہ سے چمٹائے ہوئے تھا۔ لانبا منہ تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔

میں نے دوڑ کر اسے قزاقی کو گود سے لے لیا۔ وہ ہرن کا بچہ تھا۔ آہ' میری اس خوشی کا کون اندازہ کرے گا؟ اس وقت سے مشکل امتحانات پاس کئے' بڑا عہدہ بھی پایا' رائے بہادر بھی ہوا۔ مگر ویسی خوشی پھر نہ نصیب ہوئی۔ میں اسے گود میں لئے' اس کے نرم و نازک مس سے لطف اندوز ہوتا ہوا مکان کی طرف دوڑا۔ قزاقی کو آنے میں کیوں اتنی دیر ہوئی' اس کا خیال ہی نہ رہا۔

میں نے پوچھا — یہ کہاں ملا' قزاقی؟

قزاقی۔ بھیا' یہاں سے تھوڑی دور پر ایک چھوٹا سا جنگل ہے۔ اس میں بہت سے ہرن ہیں۔ میرا بہت جی چاہتا تھا کہ کوئی بچہ مل جائے تو تمہیں دوں۔ آج یہ بچہ ہرنوں کے جھنڈ کے ساتھ دکھائی دیا۔ میں جھنڈ کی طرف دوڑا تو سب کے سب بھاگے۔ یہ بچہ بھی بھاگا پر میں نے پیچھا نہ چھوڑا اور ہرن تو بہت دور نکل گئے پر یہی بچہ پیچھے رہ گیا۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ اسی سے تو اتنی دیر ہوئی۔

اس طرح باتیں کرتے ہم دونوں ڈاک خانہ پہنچے۔ بابو جی نے مجھے نہ دیکھا' ہرن کے بچے کو بھی نہ دیکھا' قزاقی ہی پر ان کی نگاہ پڑی۔ بگڑ کر بولے — آج اتنی دیر کہاں

لگائی؟ اب تھیلا لے کر آیا ہے۔ اسے لے کر کیا کروں؟ ڈاک تو چلی گئی۔ بتا تو نے اتنی دیر کہاں لگائی۔

قزاقی کے منہ سے آواز نہ نکلی۔

بابو جی نے کہا۔ تجھے شاید اب نوکری نہیں کرنی ہے۔ رذیل ہے نہ' پیٹ بھرا تو موٹا ہو گیا۔ جب بھوکوں مرنے لگے گا تب آنکھیں کھلیں گی۔ قزاقی خاموش کھڑا رہا۔

بابو جی کا غصہ اور بڑھا' بولے ـــــ اچھا' تھیلا رکھ دے اور اپنے گھر کی راہ لے۔ سور' اب ڈاک لے کے آیا ہے۔ تیرا کیا بگڑے گا؟ جہاں چاہے گا مزدوری کرے گا۔ ماتھے تو میرے جائے گی' جواب تو مجھ سے طلب ہو گا۔

قزاقی نے رونی صورت بنا کر کہا۔ سرکار' اب کبھی دیر نہ ہو گی۔ بابو۔ آج کیوں دیر کی۔ اس کا جواب دے۔

قزاقی کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ تعجب تو یہ تھا کہ میری زبان بھی بند ہو گئی۔ بابو جی بڑے غصہ ور تھے۔ انہیں کام بہت کرنا پڑتا تھا۔ اسی وجہ سے بات بات پر جھنجلا پڑتے تھے۔ میں تو ان کے سامنے کبھی جاتا ہی نہ تھا۔ وہ بھی مجھے کبھی پیار نہ کرتے تھے۔ دن میں وہ صرف دو بار ایک ایک گھنٹہ کے لئے کھانا کھانے جاتے تھے' باقی تمام دفتر میں لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے بار بار ایک اسسٹنٹ کے تعطیل کے دن بھی بابو جی دفتر ہی میں رہتے تھے۔ صرف والدہ ان کے غصہ کو فرو کرنا جانتی تھیں مگر وہ دفتر میں کیسے آئیں؟ بیچارہ قزاقی اسی وقت میرے دیکھتے دیکھتے نکال دیا گیا۔ اس کا بلم' چپراس اور صافہ چھین لیا گیا اور اسے ڈاکخانہ سے نکل جانے کا نادر شاہی حکم دے دیا گیا۔ آہ' اس وقت میرا ایسا جی چاہتا تھا کہ میرے پاس سونے کی لنکا ہوتی تو قزاقی کو دے دیتا اور بابو کو دکھلا دیتا کہ آپ کے نکال دینے سے قزاقی کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ کسی سپاہی کو اپنی تلوار پر جتنا غرور ہوتا ہے اتنا ہی غرور قزاقی کو اپنی چپراس پر تھا۔ جب وہ چپراس کھولنے لگا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور اس سارے فساد کی جڑ وہ نازک شے تھی جو میری گود میں منہ چھپائے ایسے آرام سے بیٹھی ہوئی

تھی گویا ماں کی گود میں ہو۔ جب قزاقی چلا تو میں بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلا۔ میرے گھر کے دروازہ پر آکر قزاقی نے کہا۔ بھیا! اب گھر جاؤ' سانجھ ہو گئی۔

میں چپ چاپ کھڑا اپنے آنسوؤں کے جوش کو پوری طاقت سے ضبط کر رہا تھا۔

قزاقی پھر بولا ---- بھیا' میں کہیں باہر تھوڑا ہی چلا جاؤں گا پھر آؤں گا اور تمہیں کندھے پر بٹھا کر دوڑ آؤں گا۔ بابو جی نے نوکری لے لی ہے تو کیا اتنا بھی نہ کرنے دیں گے؟ تم کو چھوڑ کر میں کہیں نہ جاؤں گا بھیا جا کر اماں سے کہہ دو' کجا کی جاتا ہے' اس کا کہا سنا ماپھ کریں۔

میں دوڑا ہوا گھر گیا مگر ماں سے کچھ کہنے کے بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں رسوئیں سے باہر آکر پوچھنے لگیں۔ کیا ہوا بیٹا؟ کس نے مارا؟ بابو جی نے کچھ کہا ہے؟ اچھا' رہ تو جاؤ' آج گھر آتے ہیں تو پوچھتی ہوں۔ جب دیکھو میرے لڑکے کو مارا کرتے ہیں۔ چپ رہو بیٹا' اب تم ان کے پاس کبھی مت جانا۔

میں نے بڑی مشکل سے آواز سنبھال کر کہا ---- قزاقی ....

ماں نے سمجھا کہ قزاقی نے مارا ہے۔ اچھا آنے دو قزاقی کو' دیکھو کھڑے کھڑے نکلوائے دیتی ہوں۔ ہرکارہ ہو کر میرے راجہ بیٹے کو مارے۔ آج ہی تو صافہ' بلم' سب چھنوائے لیتی ہوں۔ واہ!

میں نے جلدی سے کہا۔ نہیں' قزاقی نے نہیں مارا۔ بابو جی نے اسے نکال دیا۔ اس کا صافہ بلم چھین لیا۔ چپڑاس بھی لے لی۔ ماں۔ یہ تمہارے بابو جی نے بہت برا کیا ہے۔ وہ بیچارہ اپنے کام میں مستعد رہتا ہے' پھر اسے کیوں نکالا؟

میں نے کہا۔ آج اسے دیر ہو گئی تھی۔

یہ کہہ کر میں نے ہرن کے بچے کو گودی سے اتار دیا۔ گھر میں اس بھاگ جانے کا اندیشہ نہ تھا۔ اب تک ماں کی نگاہ بھی اس پر نہ پڑی تھی۔ اسے پھدکتے دیکھ کر وہ یکایک چونک پڑیں اور لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا کہیں وہ خوفناک جانور مجھے کاٹ نہ لے۔ میں کہاں تو پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا' کہاں ماں کی اس گھبراہٹ پر کھلکھلا کر ہنس

پڑا۔

ماں۔ ارے' یہ تو ہرن کا بچہ ہے۔ کہاں ملا؟

میں نے ہرن کے بچے کا سارا ماجرا اور اس کے خوفناک نتیجہ کے حال ابتدا سے انتہا تک کہہ سنایا ـــــ اماں! یہ اتنا تیز بھاگتا تھا کہ کوئی دوسرا ہوتا تو پکڑ ہی نہ سکتا۔ سن سن ہوا کی طرح اڑتا چلا جاتا تھا۔ قزاقی پانچ چھ گھنٹے تک اس کے پیچھے دوڑتا رہا تب کہیں بچہ جا کر ملے۔ اماں؟ قزاقی کی طرح کوئی دنیا بھر میں نہیں دوڑ سکتا۔ اسی سے تو دیر ہو گئی۔ سو بابو جی نے بیچارے کو نکال دیا۔ چڑاس' صافہ' بلم سب چھین لئے۔ اب بیچارہ کیا کرے گا؟ بھوکوں مرجائے گا۔

ماں نے پوچھا ـــ کہاں ہے قزاقی' ذرا اسے بلا تو لاؤ۔

میں نے کہا۔ باہر تو کھڑا ہے۔ کہتا ہے' اماں جی سے میرا کہا سنا معاف کرا دینا۔

اب تک ماں میری باتوں کا مذاق سمجھ رہی تھیں۔ شاید وہ سمجھتی تھیں کہ بابو جی نے قزاقی کو ڈانٹا ہو گا۔ مگر میرا آخری جملہ سن کر انہیں خیال ہوا کہ کہیں واقعی تو قزاقی برخاست نہیں کر دیا گیا۔ وہ باہر جا کر قزاقی قزاقی پکارنے لگیں مگر قزاقی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے بار بار پکارا رو رو کر پکارا' مگر قزاقی وہاں نہ تھا۔

کھانا تو میں نے کھا لیا بچے غم میں بھی کھانا نہیں ترک کرتے۔ خصوصاً" جب ربڑی بھی سامنے ہو۔ مگر بڑی رات تک پڑے پڑے سوچتا رہا میرے پاس روپے ہوتے تو ایک لاکھ روپے قزاقی کو دے دیتا اور کہتا کہ بابو جی سے کبھی مت بولنا ـــــ بیچارہ بھوکوں مرجائے گا۔ دیکھیں کل آتا ہے یا نہیں' اب کیا کرے گا آ کر؟ مگر آنے کو تو کہہ گیا ہے۔ میں کل اسے اپنے ساتھ کھانا کھلاؤں گا۔

یہی ہوائی قلعے بناتے بناتے مجھے نیند آ گئی۔

دوسرے روز تمام دن اپنے ہرن کے بچے کی آؤ بھگت میں مشغول رہا۔ پہلے اس کے نام رکھنے کی رسم ادا ہوئی۔ منو نام رکھا گیا۔ پھر میں نے اس کا اپنے جملہ دوستوں

اور ہم سبق لڑکوں سے تعارف کرایا۔ ایک ہی روز میں وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گیا کہ میرے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔ اتنی ہی دیر میں نے اسے اپنی زندگی میں ایک اہم جگہ دے دی۔ اپنے مستقبل میں بننے والے شاندار محل میں اس کے لئے ایک علیحدہ کمرہ بنانے کا بھی تہیہ کر لیا۔ پلنگ' فٹن وغیرہ کی بھی تجاویز کر لیں۔

لیکن شام ہوتے ہی میں سب چھوڑ چھاڑ کر سڑک پر جا کھڑا ہوا اور قزاقی کی راہ دیکھنے لگا۔ یہ جانتا تھا کہ قزاقی نکال دیا گیا ہے' اب اسے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی' پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے یہ امید ہو رہی تھی کہ وہ آ رہا ہے۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ قزاقی بھوکوں مر رہا ہو گا۔ میں فوراً" گھر گیا۔ والدہ چراغ جلا رہی تھیں میں نے چپکے سے ایک ٹوکری میں آٹا نکالا اور آٹا ہاتھوں میں لپیٹے' ٹوکری سے گرتے ہوئے آٹے کی ایک لکیر بناتا ہوا بھاگا آ کر سڑک پر کھڑا ہوا ہی تھا کہ قزاقی سامنے سے آتا نظر پڑا۔ اس کے پاس بلم بھی تھا۔ کمر میں چپراس بھی تھی اور سر پر صافہ بھی بندھا ہوا تھا۔ اس کے بلم میں ڈاک تھیلا بھی بندھا ہوا تھا۔ میں دوڑ کر اس کی کمر سے لپٹ گیا اور متحیّر ہو کر بولا تمہیں چپراس اور بلم کہاں سے مل گیا قزاقی؟ قزاقی نے مجھے اٹھا کر کندھے پر بٹھلاتے ہوئے کہا۔ وہ چپراس کس کام کی تھی بھیا' وہ تو گلامی کی چپراس تھی۔ یہ اپنی خوشی کی چپراس ہے۔ پہلے سرکار کا نوکر تھا اب تمہارا نوکر ہوں۔

یہ کہتے کہتے اس کی نگاہ ٹوکری پر پڑی جو وہیں رکھی تھی۔ بولا ... یہ کیسا ہے بھیا؟ میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ تمہارے ہی لئے تو لایا ہوں تم بھوکے ہو گے' آج کیا کھایا ہو گا۔؟

قزاقی کی آنکھیں تو میں نہ دیکھ سکا' اس کے کندھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہاں' اس کی آواز سے معلوم ہوا کہ اس کا گلا بھر آیا ہے۔ بولا ---- بھیا! کیا روکھی روٹیاں کھاؤں گا۔ دال نمک گھی اور تو کچھ نہیں ہے۔

میں اپنے سہو پر بہت نادم ہوا۔ سچ تو ہے کہ بیچارہ روکھی روٹیاں کیسے کھائے گا؟ لیکن نمک دال اور گھی کیس لاؤں؟ اب تو ماں چوکے میں ہو گی۔ آٹا لے کر تو کسی

طرح بھاگ آیا تھا' (ابھی تک مجھے نہ معلوم تھا کہ میری چوری پکڑ لی گئی' آٹے کی لکیر نے سراغ دے دیا ہے) اب یہ تین تین کیسے لاؤں گا؟ ماں سے مانگوں گا تو کبھی نہ دیں گی۔ ایک ایک پیسے کے لئے تو گھنٹوں رلاتی ہیں' اتنی سبھی چیزیں کیوں دینے لگیں۔ یکایک مجھے ایک بات یاد آئی میں نے اپنی کتابوں سے بستہ میں کئی آنے پیسے رکھ چھوڑے تھے۔ مجھے پیسے جمع کر کے رکھنے میں بڑی خوشی ہوتی تھی۔ معلوم نہیں' اب وہ عادت کیوں تبدیل ہو گئی۔ اب بھی وہی حالت ہوتی تو شاید اس قدر فاقہ مست نہ رہتا۔ بابو جی مجھے پیار تو کبھی نہ کرتے تھے مگر پیسے خوب دیتے تھے۔ شاید اپنے کام میں مصروف رہنے کے سبب مجھ سے گلا چھڑانے کے لئے اسی کام کو سب سے آسان سمجھتے تھے۔ انکار کرنے میں میرے رونے اور مچلنے کا اندیشہ تھا اس بلا کو وہ دور ہی سے ٹال دیتے تھے۔ ماں کا مزاج اس کے برعکس ٹھیک تھا۔ انہیں میرے رونے اور مچلنے سے کسی کام میں خلل پڑنے کا خوف نہ تھا۔ آدمی لیٹے لیٹے دن بھر رونا سن سکتا ہے' حساب لگاتے ہوئے زور کی آواز سے بھی دھیان بٹ جاتا ہے۔ اماں مجھے پیار تو بہت کرتی تھیں مگر پیسہ کا نام سنتے ہی ان کی تیوریاں بدل جاتی تھیں۔ میرے پاس کتابیں نہ تھیں' ہاں ایک بستہ تھا۔ جس میں ڈاکخانہ کے دو چار فارم تہہ کر کے کتابی صورت میں رکھے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا۔ دال نمک اور گھی کے لئے کیا اتنے پیسے کافی نہ ہوں گے؟ میری تو مٹھی میں نہیں سماتے! خیر' یہ فیصلہ کر کے میں نے کہا --- اچھا' مجھے اتار دو تو میں دال اور نمک لا دوں۔ مگر روز آیا کرو گے نہ؟

قزاقی۔ بھیا' کھانے کو دو گے تو کیوں نہ آؤں گا؟

میں نے کہا ---- میں روز کھانے کو دوں گا۔

قزاقی بولا۔ تو میں بھی روج آؤں گا۔

میں نیچے اترا اور دوڑ کر اپنی ساری پونجی اٹھا لایا۔ قزاقی کو روزانہ بلانے کے لئے اس وقت میرے پاس کوہ نور' ہیرا ہوتا تو اسے بھی نذر کرنے میں مجھے تامل نہ ہوتا۔

قزاقی نے متحیر ہو کر پوچھا۔ یہ پیسے کہاں پائے بھیا؟

میں نے فخر سے کہا۔ میرے ہی تو ہیں!

قزاقی۔ تمہاری اماں جی تم کو ماریں گی۔ کہیں گی کہ کجا کی نے پھسلا کر منگوا لئے ہوں گے' بھیا' ان پیسوں کی مٹھائی لے لینا۔ اور آٹا مٹکے میں رکھ دینا۔ میں بھوکوں نہیں مرتا۔ میرے دو ہاتھ ہیں' بھلا میں بھوکوں مر سکتا ہوں؟

میں نے ہر چند کہا کہ پیسے میرے ہیں لیکن قزاقی نے نہ لئے۔ اس نے بڑی دیر تک ادھر ادھر کی سیر کرائی' گیت سنائے اور مجھے گھر پہنچا کر بلا گیا میرے دروازہ پر آٹے کی ٹوکری بھی رکھ دی۔

میں نے مکان میں قدم رکھا ہی تھا کہ ماں نے ڈانٹ کر کہا۔ کیوں رے چور' تو آٹا کہاں لے گیا تھا؟ اب چوری کرنا سیکھتا ہے؟ بتا کس کو آٹا دے آیا۔ ورنہ تیری کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گی۔

میری نانی مر گئی! ماں غصہ میں شیرنی ہو جاتی تھیں۔ میں سٹ پٹا کر بولا --- کسی کو تو نہیں دے آیا۔

ماں تو نے نہیں نکالا؟ دیکھ کتنا آٹا سارے صحن میں بکھرا پڑا ہے۔

میں خاموش کھڑا تھا۔ وہ کتنا ہی دھمکاتی تھیں' چمکارتی تھیں مگر میری زبان نہ کھلتی تھی۔ انے والی مصیبت کے خوف سے جان سوکھ رہی تھی۔ یہاں تک بھی کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ بگڑتی کیوں؟ آٹا تو دروازے پر رکھا ہوا ہے۔ نہ اٹھا کر لاتے بنتا تھا۔ گویا کام کرنے کی قوت ہی جاتی رہی تھی۔ گویا پیروں میں ہلنے کی طاقت ہی نہ تھی۔ دفعتاً" قزاقی نے پکارا۔ بہو جی آٹا یہ دروازے پر رکھا ہوا ہے۔ بھیا مجھے دینے کو لے گئے تھے۔

یہ سنتے ہی ماں دروازہ کی طرف چلی گئیں۔ قزاقی سے وہ پردہ نہ کرتی تھیں۔ انہوں نے قزاقی سے کوئی بات کی یا نہیں' یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اماں جی خالی ٹوکری لئے ہوئے گھر میں آئیں۔ پھر کوٹھری میں جا کر صندوق سے کچھ نکالا اور دروازہ کی طرف گئیں۔ میں نے دیکھا' ان کی مٹھی بند تھی۔ اب مجھ سے وہاں کھڑا نہ رہا

گیا۔ ماں کے پیچھے پیچھے میں بھی گیا۔ ماں نے دروازے پر کئی بار پکارا مگر قزاقی چلا گیا تھا!

میں نے بڑی بہادری سے کہا۔ میں جا کر کھوج لاؤں' اماں جی؟

ماں نے کواڑ بند کرتے ہوئے کہا۔ تم اندھیرے میں کہاں جاؤ گے؟ ابھی تو کھڑا تھا۔ میں نے کہا کہ یہیں رہنا' میں آتی ہوں۔ تب تک نہ جانے کہاں کھسک گیا۔ بڑا سکوچی آدمی ہے۔ آٹا تو لیتا ہی نہ تھا۔ میں نے زبردستی اس کے انگوچھے میں باندھ دیا۔ مجھے تو بیچارے پر بڑا ترس آتا ہے۔ نہ جانے' غریب کے گھر میں کچھ کھانے کو ہے یا نہیں۔ روپے لائی تھی کہ دے دوں گی مگر نہ جانے کہاں چلا گیا۔

اب تو مجھے بھی ہمت ہوئی۔ میں نے اپنی چوری کی پوری داستان کہہ ڈالی۔ بچوں کے ساتھ سمجھدار بچے بن کر والدین ان پر جتنا اثر ڈال سکتے ہیں' جتنی نصیحت دے سکتے ہیں' اتنا بڈھے بن کر نہیں۔

اماں نے کہا --- تم نے مجھ سے پوچھ کیوں نہ لیا؟ کیا میں قزاقی کو تھوڑا سا آٹا نہ دے دیتی۔؟

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ دل میں کہا' اس وقت تمہیں قزاقی پر رحم آ گیا ہے۔ جو چاہو دے ڈالو۔ لیکن میں مانگتا تو مارنے دوڑتیں ہاں یہ سوچ کر دل خوش ہوا کہ اب قزاقی بھوکوں نہ مرے گا۔ اماں جی اسے روز کھانے کو دیں گی اور وہ روز مجھے کندھے پر بٹھا کر سیر کروا دے گا۔

دوسرے روز میں دن بھر منو کے ساتھ کھیلتا رہا۔ شام کو سڑک پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ مگر اندھیرا ہو گیا اور قزاقی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چراغ جل گیا راستہ میں سناٹا چھا گیا مگر قزاقی نہ آیا؟

میں روتا ہوا گھر آیا۔ ماں نے پوچھا۔ کیوں روتے ہو' بیٹا؟ کیا قزاقی نہیں آیا؟

میں اور زور سے رونے لگا۔ ماں نے مجھے چھاتی سے لگا لیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ان کا گلا بھی بھر آیا ہے۔ انہوں نے کہا۔ بیٹا چپ ہو جاؤ۔ میں کل کسی ہرکارے

کو بھیج کر قزاقی کی بلاؤں گی۔

میں روتے ہی روتے سو گیا۔ صبح جونہی آنکھیں کھلیں۔ میں نے ماں سے کہا۔ قزاقی کو بلوا دو۔

ماں نے کہا آدمی گیا ہے بیٹا' قزاقی آتا ہو گا۔ میں خوش ہو کر کھیلنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اماں جی جو بات کہتی ہیں اسے پورا ضرور کرتی ہیں۔ انہوں نے سویرے ہی ایک ہلکارا کو بھیج دیا تھا۔ دس بجے جب میں منو کو لئے ہوئے گھر آیا تو معلوم ہوا کہ قزاقی اپنے گھر پر نہیں ملا۔ اس کی بیوی رو رہی تھی کہ نہ جانے کہاں چلے گئے۔ اسے اندیشہ تھا کہ وہ کہیں بھاگ گیا ہے۔

بچوں کا دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ دوسرا نہیں کر سکتا ان میں اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہوتے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کونسی بات انہیں بے چین کر رہی ہے' کونسا کانٹا ان کے دل میں کھٹک رہا ہے' کیوں بار بار انہیں رونا آتا ہے۔ کیوں وہ من مارے بیٹھے ہیں' کھیلنے میں جی نہیں لگتا۔ میری بھی یہی حالت تھی' کبھی گھر میں آتا' کبھی باہر جاتا' کبھی سڑک پا جا پہنچتا۔ آنکھیں قزاقی کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ وہ کہاں چلا گیا؟ کہیں بھاگ تو نہیں گیا؟

تیسرے پہر کو میں گم شدہ سا سڑک پر کھڑا تھا۔ یکایک میں نے قزاقی کو ایک گلی میں دیکھا۔ ہاں' وہ قزاقی ہی تھا! میں اس کی طرف پکارتا ہوا دوڑا مگر گلی میں اس کا پتہ نہ تھا۔ نہ جانے کدھر غائب ہو گیا۔ میں نے گلی کو اس سرے سے اس سرے تک دیکھا مگر کہیں قزاقی کو بو تک نہ ملی۔

گھر جا کر میں نے ماں سے یہ بات کہی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ یہ بات سن کر بہت متفکر ہو گئیں۔ اس کے بعد دو تین روز تک قزاقی نہ دکھائی دیا۔ میں بھی اب اس کو کچھ کچھ بھولنے لگا۔ بچے پہلے جتنی محبت کرتے ہیں بعد کو اتنے ہی بے اعتناء بھی ہو جاتے ہیں۔ جس کھلونے پر جان دیتے ہیں اسی کو دو چار روز بعد پٹک کر توڑ ڈالتے ہیں۔

دس بارہ روز اور گزر گئے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ بابو جی کھانا کھا رہے تھے۔ میں منو کے پیروں میں پیتل کی پنچیاں باندھ رہا تھا۔ ایک عورت گھونگھٹ نکالے ہوئی اور صحن میں کھڑی ہو گئی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے اور میلے تھے۔ مگر گوری۔ خوبصورت عورت تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ بھیا' بہو جی کہاں ہیں؟ میں نے اس کے پاس جا کر اس کا منہ دیکھتے ہوئے کہا۔ تم کون ہو؟ کیا بیچتی ہو؟

عورت۔ کچھ بیچتی نہیں ہوں۔ تمہارے لئے یہ کمل گئے لائی ہوں بھیا' تمہیں تو کمل گئے بہت اچھے لگتے ہیں نا؟ میں نے اس کے ہاتھوں سے لٹکتی ہوئی پوٹلی کو شک بھری نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔ کہاں سے لائی ہو' دیکھیں۔

عورت۔ تمہارے ہرکارے نے بھیجا ہے بھیا۔

میں نے اچھل کر پوچھا --- قزاقی نے؟

عورت نے سر ہلا کر ہاں کہا اور پوٹلی کھولنے لگی۔ اتنے میں ماں بھی رسوئیں سے نکل آئیں۔ اس نے ماں کے پیر چھوئے۔ ماں نے پوچھا تو قزاقی کی گھر والی ہے؟

ماں۔ آج کل قزاقی کیا کرتا ہے۔

عورت نے رو کر کہا۔ بہو جی' جس دن سے آپ کے پاس سے آٹا لے کر گئے ہیں اسی دن سے بیمار پڑتے ہیں۔ بس بھیا بھیا کیا کرتے ہیں۔ بھیا ہی میں ان کا من بسا رہتا ہے۔ چونک چونک کر بھیا بھیا کہتے ہوئے دروازے کی طرف دوڑتے ہیں۔ نہ جانے' انہیں کیا ہو گیا ہے' بہو جی۔ ایک دن مجھ سے کچھ کہا نہ سنا' گھر سے چل دئے اور ایک گلی میں چھپ کر بھیا کو دیکھتے رہے۔ جب بھیا نے انہیں دیکھ لیا تو بھاگے تمہارے پاس آتے ہوئے لجاتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ہاں ہاں' میں نے اس دن تم سے جو کہا تھا' اماں جی' ماں۔ گھر میں کچھ کھانے پینے کو ہے؟

عورت۔ ہاں بہو جی' تمہارے آسرباد سے کھانے پینے کا دکھ نہیں ہے۔ آج سیرے اٹھے اور تالاب کی طرف چلے گئے۔ بہت کہتی رہی کہ باہر مت جاؤ' ہوا لگ

جائے گی۔ مگر نہ مانا۔ مارے کھجوری کے پیر کانپنے لگتے ہیں۔ مگر تالاب میں گھس کر یہ کمل گٹے توڑ لائے اور مجھ سے کہا کہ لے جا' بھیا کو دے آ۔ انہیں کمل گٹے بہت اچھے لگتے ہیں۔ کسل' پھیم (خیرو عافیت پوچھتی آنا)۔

میں نے پوٹلی سے کمل گٹے نکال گئے اور مزے سے کھا رہا تھا۔ ماں نے بہت آنکھیں دکھائیں مگر یہاں اتنا صبر کہاں؟

میں نے کہا۔ کہہ دینا' سب کسل ہے۔

میں نے کہا۔ یہ بھی کہہ دینا کہ بھیا نے بلایا ہے۔ نہ جاؤ گے تو پھر تم سے کبھی نہ بولیں گے' ہاں ----

بابو جی کھانا کھا کر نکل آئے تھے۔ تولئے سے ہاتھ منہ صاف کرتے ہوئے بولے۔ اور یہ بھی کہہ دینا کہ صاحب نے تم کو بحال کر دیا ہے۔ جلد جاؤ ورنہ کوئی دوسرا آدمی رکھ لیا جاوے گا۔

عورت نے اپنا کپڑا اٹھایا چلی گئی۔ ماں نے بہت پکارا مگر وہ نہ رکی۔ شاید اماں جی اسے آٹا دال وغیرہ دینا چاہتی تھیں۔

ماں نے پوچھا۔ سچ مچ بحال ہو گیا؟

بابو جی ۔ اور کیا جھوٹ ہی بلا رہا ہوں۔ میں نے تو پانچویں ہی روز اس کی بحال رپورٹ کی تھی۔

ماں ۔ یہ تم نے بہت اچھا کیا۔

بابو جی۔ اس کی بیماری کی یہی دوا ہے۔

علی الصباح میں اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قزاقی لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ وہ بہت دبلا ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا' بوڑھا ہو گیا ہے۔ ہرا بھرا درخت سوکھ کر ٹھونٹھ سو گیا تھا۔ میں اس کی طرف دوڑا اور اسکی کمر سے لپٹ گیا۔ قزاقی نے میرے گالوں کو چوما اور مجھے اٹھا کر کندھے پر بٹھانے کی کوشش کرنے لگا مگر نہ اٹھ سکا۔ تب وہ

چوپایوں کی طرح زمین پر ہاتھوں اور گھٹنوں پر کھڑا ہو گیا اور میں اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر ڈاکخانہ کی طرف چلا۔ میں اس وقت خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا' اور شاید قزاقی مجھ سے بھی زیادہ خوش تھا!

بابو جی نے کہا --- قزاقی' تم بحال ہو گئے۔ اب کبھی دیر نہ کرنا۔

قزاقی روتا ہوا والد صاحب کے قدموں پر گر پڑا' مگر شاید میرے نصیب میں دو سکھ بھوگنا بدا نہ تھا منو ملا تو قزاقی چھوٹا' قزاقی آیا تو منو ہاتھ سے گیا اور ایسا گیا کہ اس کے جانے کا رنج آج تک ہے۔ منو میری ہی تھالی میں کھاتا تھا۔ جب تک میں کھانے نہ بیٹھوں' وہ بھی کچھ نہ کھاتا تھا۔ اسے بھات سے بہت ہی رغبت تھی مگر جب تک خوب گھی نہ پڑا ہو اس کا جی نہ بھرتا تھا۔ وہ میرے ہی ساتھ سوتا بھی تھا اور میرے ہی ساتھ اٹھتا بھی۔ صفائی تو اسے اس قدر پسند تھی کہ رفع حاجت کے لئے گھر سے باہر میدان میں نکل جاتا تھا۔ کتوں سے اس کو چڑھ تھی کتوں کو گھر میں نہ گھسنے دیتا تھا۔ کتے کو دیکھتے ہی تھالی سے اٹھ جاتا اور اسے دوڑا کر گھر سے باہر نکال دیتا تھا۔

قزاقی کو ڈاکخانہ میں چھوڑ کر جب میں کھانا کھانے گیا تو منو بھی آ بیٹھا اور دو چار ہی لقمے کھائے تھے کہ ایک بڑا سا چھبرا کتا صحن میں آیا منو اسے دیکھتے ہی دوڑا۔ دوسرے مکان میں جا کر کتا چوہا ہو جاتا ہے۔ چھبرا کتا اسے آتے دیکھ کر بھاگا۔ منو کو اب لوٹ آنا چاہئے تھا۔ مگر وہ کتا اس کے لئے ملک الموت تھا۔ منو کو اسے گھر سے نکال کر بھی صبر نہ ہوا۔ وہ اسے گھر سے باہر میدان میں بھی دوڑانے لگا۔ منو کو شاید خیال نہ رہا۔ کہ یہاں میری عملداری نہیں ہے۔ وہ اس احاطہ میں پہنچ گیا تھا جہاں چھبرے کا بھی اتنا ہی اقتدار تھا جتنا منو کا اپنے گھر میں۔ منو کتوں کو بھگاتے بھگاتے شاید اپنے قوت بازو پر گھمنڈ کرنے لگا تھا۔ وہ یہ نہ سمجھتا تھا کہ مکان میں اس کی حمایت میں مالک مکان کا خوف کام کیا کرتا ہے۔ چھبرے نے اس میدان میں آتے ہی پلٹ کر منو کی گردن دبا دی۔ بیچارے منو کے منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ جب پڑوسیوں نے شور مچایا تو میں دوڑا۔ دیکھا تو منو مرا پڑا ہے اور چھبرے کا کہیں پتہ

نہیں۔

لاٹری

جلدی سے مالدار بن جانے کی ہوس کسے نہیں ہوتی۔ ان دنوں جب فرنچ لاٹری کے ٹکٹ آئے تو میرے عزیز دوست بکرم سنگھ کے والد' چچا' بھائی۔ ماں سبھی نے ایک ایک ٹکٹ خرید لیا۔ کون جانے کس کی تقدیر زور کرے' روپے رہیں گے تو گھر ہی میں' کسی کے نام آ جائیں۔

مجھے بھی اپنی تقدیر آزمانے کی سوجھی' اس وقت مجھے زندگی کا تھوڑا بہت تجربہ ہوا تھا' وہ بہت ہمت افزا نہ تھا لیکن بھئی تقدیر کا حال کون جانے گاہ باشد کہ کودک ناداں۔ ایک بار اپنی تقدیر آزمانے کو دل بیتاب ہو گیا اور بکرم بھی دوسروں کا دست نگر نہ بننا چاہتا تھا۔ جس کے نام روپے آئیں گے۔ وہ خود موج اڑائے گا۔ اسے کون پوچھتا ہے۔ دس پانچ ہزار اس کے حصے میں آ جائیں گے' مگر اس سے کیا ہو گا۔ اس کی زندگی میں بڑے بڑے منصوبے تھے۔ پہلے تو ساری دنیا کی سیاحت کرنی تھی۔ ایک

ایک کونے کی۔ عام سیاحوں کی طرح نہیں ہو کہ تین ہفتہ میں ساری دنیا میں آندھی کی طرح اڑ کر گھر آ پہنچے۔ وہ ایک خطہ میں کافی عرصہ تک رہ کر وہاں کے باشندوں' معاشرت کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ پیرو برازیل' مڈغاسکر اور اربی سینیا' یہ سبھی دشوار گزار خطے اس کے پروگرام میں تھے۔ پھر اسے ایک بہت بڑا کتب خانہ تیار کرانا تھا جس میں ساری دنیا کی کتابیں رکھی جائیں۔ اس کے علاوہ لاکھ تک صرف کرنے کو تیار تھا۔ والد یا چچا کے ہاتھ روپے آئے تو شاید دو چار ہزار مل جائیں۔ بڑے بھائی کے نام آئے تو دھیلا بھی نہ ملے گا۔ ہاں اماں کے ہاتھ آئے تو بیس ہزار یقینی ہیں' مگر اس سے کہیں پیاس بجھتی ہے۔ منصوبے تو اتنے اونچے تھے۔ لیکن روپے نہ ان کے پاس تھے نہ گھر سے روپے ملنے کی اسے امید تھی۔ ممکن تھا بہت ضد کرتا تو مل بھی جاتے مگر وہ اس امر کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ میرے پاس بھی روپے تھے' میں اسکول میں ماسٹر تھا' بیس روپے ملتے تھے۔ دس گھر بھیج دیتا' دس میں لشٹم پشٹم اپنا گزارہ کرتا۔ ایسی حالت میں پانچ روپے کے ٹکٹ خریدنا میرے لئے مشکل ہی نہیں محال تھا۔

بکرم نے کہا "کہو تو میں اپنی انگوٹھی بیچ دوں' کہہ دوں گا انگلی سے پھسل پڑی" میں نے منع کیا تھا "نہیں چوری فورا" کھل جائے گی اور مفت میں شرمندگی ہو گی۔ ایسا کام کیوں کرو کہ بعد میں خفت ہو۔" یہ تجویز ہوئی کہ ہم دونوں اپنی اپنی پرانی کتابیں کسی سیکنڈ ہینڈ کتابوں کے دوکاندار کے ہاتھ بیچ ڈالیں اور اس روپے سے ٹکٹ خریدیں۔ ہم دونوں کے پاس اسکول کی کتابیں ار تھمیٹک' الجبرا' جیومیٹری' جغرافیہ موجود تھیں۔ میں تو ماسٹر تھا کسی بک سیلر کی دوکان پر جاتے جھینپتا تھا۔ قریب قریب سبھی مجھے پہچانتے تھے۔ اس لئے یہ خدمت بکرم کے سپرد ہوئی اور وہ آدھ گھنٹے میں پانچ روپے کا ایک نوٹ لئے آ پہنچا۔ کتابیں پچیس سے کم کی نہ تھیں مگر یہ پانچ اس وقت ہمارے لئے پانچ ہزار کے برابر تھے۔ فیصلہ ہو گیا۔ ہم دونوں ساجھے میں ٹکٹ لیں گے آدھا میرا ہو گا آدھا بکرم کا' دس لاکھ میں پانچ لاکھ میرے حصہ میں آئیں گے۔ پانچ لاکھ بکرم کے' ہم اپنے اسی میں خوش تھے۔ ہاں بکرم کو اپنی سیاحت والی

اسکیم میں کچھ ترمیم کرنا پڑی۔ کتب خانہ کی تجویز میں کسی قسم کی قطع و برید ناممکن تھی۔ یہ بکرم کی زندگی کا مقصد دلی تھا۔

میں نے اعتراض کیا۔ "یہ لازمی نہیں کہ تمہارا کتب خانہ شہر میں سب سے زیادہ شاندار ہو ایک لاکھ بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔"

بکرم مستقل تھا۔ "ہرگز نہیں' کتب خانہ تو شہر میں لاثانی ہو گا۔ کیوں تم کچھ مدد نہ کرو گے؟"

میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "بھئی میری ضرورتیں مقابلتاً کہیں زیادہ ہیں۔"

"تمہارے گھر میں کافی جائداد موجود ہے۔ والدین بھی زندہ ہیں کسی قسم کا بار تمہارے اوپر نہیں ہے۔ میرے سر پر تو ساری گرہستی کا بوجھ ہے۔ دو بہنوں کی شادیاں ہیں' دو بھائیوں کی تعلیم ہے۔ نیا مکان بنوانا ہی پڑے گا۔ میں تو ایسا انتظام کروں گا کہ سارے مصارف سود سے نکل آئیں اور اصل میں داغ نہ لگنے پائے۔ کچھ ایسی قیدیں لگا دوں گا میرے بعد کوئی اصلی کو نہ نکال سکے۔"

تم نے سوچی تو بہت دور کی ہے' لیکن بینکوں کا شرح سود گرا ہوا ہے۔

"پانچ لاکھ کی رقم بھی تو کم نہیں۔ اگر پانچ فیصدی بھی ہے ۲۵ ہزار سالانہ ہوئے' تھوڑے ہیں۔ ہم نے کئی بینکوں کی شرح سود دیکھا۔ واقعی بہت کم تھا۔ خیال آیا کیوں نہ لین دین میں کاروبار شروع کر دیا جائے۔ بکرم اور میں دونوں کی مشترکہ کمپنی ہو۔ لین دین میں سود بھی اچھا ملے گا اور اپنا رعب داب رہے گا۔ اچھے اچھے گھٹنے ٹیکیں گے' ہاں جب تک اچھی جائداد نہ ہو کسی کو روپیہ نہ دیا جائے' چاہے کتنا ہی معتبر آسامی ہو' مجبوری معتبروں کو بھی غیر معتبر بنا دیتی ہے' جائداد کی کفالت پر رہن نامہ لکھا کر روپیہ دینے میں کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔ روپے نہ وصول ہوں تو جائداد تو مل ہی جاتی ہے۔"

"مگر لاٹری کے ٹکٹ پر دو نام نہیں رہ سکتے کس کا نام دیا جائے۔"

بکرم نے کہا۔ "میرا نام رہے گا۔"

"کیوں میرا کیوں نہ رہے گا؟"

"تمہارا ہی نام سہی' لیکن میری بہت دل شکنی ہو گی' اگر روپے مل گئے تو میں گھر والوں پر گولا چھوڑوں گا اور لوگوں کو خوب چڑاؤں گا' بالکل طفلانہ خواہش ہے۔"

میں مجبور ہو گیا۔ بکرم کے نام سے ٹکٹ لیا گیا۔

ایک ایک کر کے انتظار کے دن کٹنے لگے۔ صبح ہوتے ہی ہماری نگاہ کیلنڈر پر جاتی میرا مکان بکرم کے مکان سے ملا تھا۔ اسکول جانے سے قبل اور اسکول سے آنے کے بعد ہم دونوں ساتھ بیٹھے اپنے منصوبے باندھا کرتے اور سرگوشیوں میں کہ کوئی سن نہ لے۔ ایک دن شادی کا تذکرہ چھڑ گیا۔

بکرم نے فلسفیانہ انداز سے کہا۔ "بھئی شادی وادی کا خلجان نہیں چلانا چاہتا خواہ مخواہ کی کوفت اور پریشانی' بیوی کی ناز برداری میں ہی بہت سے روپے اڑ جائیں گے۔ ہم بقائے نسل کے لئے کوئی ٹھیکہ دار ہیں؟"

میں نے شادی کے دوسرے پہلوؤں پر غور کیا۔ "ہاں یہ تو درست ہے مگر جب تک شادی و غم میں کوئی رفیق نہ ہو' دولت کا لطف ہی کیا' تنہا خوری سے انسان کی طبیعت خود نفرت کرتی ہے' میں تو بھئی عیال داری سے اتنا بیزار نہیں ہاں رفیق ہو اور وہ بیوی کے سوا دوسرا کون ہو سکتا ہے۔"

بکرم کی پیشانی پر بل پڑ گئے بولا "خیر اپنا اپنا نقطہ نظر ہے آپ کو عیال داری مبارک بندہ تو آزاد رہے گا' اپنے مزے سے جہاں چاہا اڑ گئے اور جب جی چاہا سو گئے۔ یہ نہیں کہ ہر وقت ایک پاسبان آپ کی ہر ایک حرکت پر آنکھیں لگائے بیٹھا رہے۔ ذرا سی دیر ہوئی اور فوراً" جواب طلب' آپ کہیں چلے اور فوراً" سوال ہوا' کہاں جاتے ہو؟ کیوں کسی کو مجھ سے یہ سوال کرنے کا حق ہو۔"

"میں نہ یہ سوال کسی سے کرنا چاہتا ہوں' اور نہ چاہتا ہوں مجھ سے کوئی سوال

کرے۔ نا بابا آپ کو شادی مبارک' بچے کو ذرا سا زکام ہو اور آپ اڑے چلے جا رہے ہیں ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے پاس' ذرا عمر کھسکی اور لونڈے منتیں ماننے لگے کہ کب آپ راہی عدم ہوں اور وہ گل چھرے اڑائیں' نہ نہ اس وبال...."

بکرم کی بہن کنتی نے اتنے دھماکے سے دروازہ کھولا کہ ہم دونوں چونک پڑے کوئی تیرہ چودہ سال کی تھی۔ مگر بڑی خوش مزاج اور انتہا درجہ کی شوخ۔

بکرم نے ڈانٹا "تو بڑی شیطان ہے کنتی' میں تو ڈر گیا کس نے تجھے بلایا یہاں۔"

کنتی نے مشتبہ نظروں سے بکرم کو دیکھا' جیسے کوئی تحقیقات کر رہی ہو اور بولی "تم لوگ ہر دم یہاں بیٹھے کیا باتیں کرتے ہو' جب دیکھو یہیں جمے ہو نہ کوئی کام نہ دھندا' کہیں گھومنے بھی نہیں جاتے ایسے اچھے اچھے تماشے آئے اور چلے گئے' تم چلے ہی نہیں آخر کس کے ساتھ جاؤں۔ کیا کوئی جادو منتر جگا رہے ہو؟"

بکرم ہنسا "ہاں جادو جگا رہے ہیں۔ جس میں تجھے ایسا دولہا ملے جو گن کمر روز پانچ ہنٹر جمائے۔"

کنتی نے پیٹھ کی طرف سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بولی۔

"مجھے اپنا بیاہ نہیں کرنا ہے اماں سے پچاس ہزار روپے لے لوں گی اور مزے سے عیش کروں گی کیوں کسی مرد کی غلامی کروں؟ کھلائے گا تو دو روٹیاں اور حکومت ایسی جتائے گا جیسے اس کی زر خرید لونڈی ہوں' بندی باز آئی ایسی شادی سے' میں روز اماں کے ٹکٹ کے لئے ایشور سے پرارتھنا کرتی ہوں' اماں کہتی ہیں کنواری لڑکیوں کی دعا میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ میرا تو دل کہتا ہے اماں کو ضرور روپے ملیں گے۔"

مجھے اپنی ننھیال کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بار دیہات میں بارش بالکل نہ ہوئی تھی بھادوں کا مہینہ آگیا اور پانی کی ایک بوند نہیں۔ تب گاؤں والوں نے چندہ کر کے گاؤں کی سب کنواری لڑکیوں کی دعوت کی تھی اور دوسرے دن موسلا دھار بارش ہوئی تھی۔ ضرور کنواری لڑکیوں کی دعا میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ میں نے بکرم کی طرف پر معنی نظروں سے دیکھا۔ نظروں ہی نظروں میں ہم نے فیصلہ کر لیا ایسا شفیع پا کر کیوں

چوکتے۔

بکرم بولا اچھا کنتی۔ تجھ سے ایک بات کہیں' کسی سے کہے گی تو نہیں اگر کہا تو حلال کر دوں گا۔ میں اب کے تجھے خوب دل لگا کر پڑھاؤں گا اور پاس کرا دوں گا۔ ہم دونوں نے بھی لاٹری کا ٹکٹ لیا ہے' ہم لوگوں کے لئے بھی ایشور سے دعا کرو۔ اگر روپے ملے تو تجھے ہیرے جواہرات سے مڑھ دیں گے سچ' مگر خبردار کسی سے کہنا مت۔ مگر کنتی کا ہاضمہ مضبوط نہ تھا۔ یہاں تو وہ وعدہ کر گئی' مگر اندر جاتے ہی بھانڈا پھوڑ دیا۔ ایک ہی لمحہ میں سارے گھر میں خبر پھیل گئی۔ اب جسے دیکھئے ہم دونوں کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔ پانچ روپے لے کر پانی میں ڈال دئے' گھر میں چار ٹکٹ تو تھے ہی پانچویں کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ماسٹر اسے خراب کر رہا ہے' نہ کسی سے پوچھا نہ گچھا لے کے روپے پھینک دئے۔ خود را نصیحت والی کہانی سامنے آئی۔ گھر کے بزرگ چاہے گھر میں آگ لگا دیں' کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا' بچارے چھوٹے ان کی مرضی کے خلاف آواز بھی نکالیں تو کہرام مچ جاتا ہے۔

بکرم کے والد ٹھاکر کہلاتے تھے' چچا چھوٹے ٹھاکر' دونوں ہی ملحد تھے' پکے ناستک دیوتاؤں کے دشمن' پوجا پاٹ کا مذاق اڑانے والے۔ گنگا کو پانی کی دھارا اور تیرتھوں کو سیر کے مقامات سمجھنے والے۔ مگر آج کل دونوں ہی معتقد ہو گئے تھے۔ بڑے ٹھاکر صاحب علی الصبح ننگے پاؤں اشنان کرنے جاتے' اور ادھر سے شہر کے دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہوئے کوئی گیارہ بجے گھر لوٹتے تھے۔ چھوٹے ٹھاکر گھر ہی میں بیٹھے ہوئے روز ایک لاکھ رام نام لکھ کر تب جل پان کرتے۔ دونوں صاحب شام ہوتے ہی ٹھاکر دوارے میں جا بیٹھتے اور بارہ بجے رات تک بھاگوت کی کتھا سنا کرتے تھے۔ بکرم کے بھائی صاحب کا نام تھا پرکاش' انہیں سادھو سنتوں سے عقیدت ہو گئی تھی' انہیں کی خدمت میں دوڑتے رہتے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ جہاں کسی مہاتما نے آشیرواد دیا اور ان کا نام آیا۔ رہیں بکرم کی اماں جی ان میں ایسا کوئی خاص تغیر تو نہ تھا۔ ہاں آج

کل خیرات زیادہ کرتی تھیں اور برت بھی زیادہ رکھتی تھیں۔ درگا پاٹ کا بھی انتظام کیا تھا۔ لوگ ناحق کہتے تھے کہ مادہ پرستوں میں اعتقاد نہیں ہوتا۔ میں تو سمجھتا ہوں ہم میں جو اعتقاد اور پرستش اور دین داری ہے وہ ہماری مادہ پرستی کے طفیل' ہمارا دین اور مذہب ہماری دنیا کے بلی پر لٹکا ہوا ہے۔ ہوس انسان کی رائے اور دماغ میں اتنی روحانیت پیدا کر سکتی ہے یہ میرے لئے نیا تجربہ تھا اور محض روحانیت کا ملمع نہ تھا۔ وہی خلوص' وہی نشہ' وہی انہماک گویا طبیعت ہی بدل گئی ہو۔ رہے ہم دونوں' ساجھے دار تھے ہمارے پاس روپے نہ تھے' نہ اتنا وقت تھا۔ مجھے نوکری بچانی تھی بکرم کو کالج جانا تھا۔ ہم دونوں ہاتھ مل رہے تھے۔ جو شیوں کی تلاش میں رہتے تھے مگر ان کے لئے ہمارے پاس نیاز مندی اور خدمت گزاری کے سوا اور کیا تھا۔

جوں جوں قتل کی رات قریب آتی جاتی تھی ہمارا سکون غائب ہوتا جاتا تھا۔ ہمیشہ اسی طرف دھیان لگا رہتا۔ میرے دل میں خواہ مخواہ یہ شبہ ہونے لگا کہ کہیں بکرم مجھے حصہ دینے سے انکار کر دے تو کیا کروں۔ صاف انکار کر جائے کہ تم نے ٹکٹ میں ساجھا ہی نہیں کیا' نہ کوئی دوسرا ثبوت' سارا دارومدار بکرم کی نیت پر ہے۔ اسی کی نیت میں ---- ذرا سا خلل آیا اور میرا کام تمام' کہیں فریاد نہیں کر سکتا۔ زبان تک نہیں کھول سکتا۔ اب اگر تحریر کے لئے کہوں تو بدمزگی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں' اگر اس کی نیت بگڑ گئی ہے تب تو وہ ابھی سے انکار کر دے گا۔ اگر نیت درست ہے تو اس شبہ سے اسے روحانی صدمہ ہو گا۔ آدمی تو ایسا نہیں ہے۔ لیکن بھئی دولت پا کر ایمان سلامت رکھنا مشکل ہے۔ ابھی تو روپے نہیں ملے ہیں۔ اس وقت ایماندار بننے میں کچھ ہرج نہیں ہوتا آزمائش کا وقت تو جب آئے گا جب روپے مل جائیں گے۔ میں نے اپنے باطن کا جائزہ لیا۔ اگر ٹکٹ میرے نام کا ہوتا اور حسن اتفاق سے میرا نام آ جاتا تو کیا میں نصف رقم بے چون و چرا بکرم کے حوالے کر دیتا؟' ---- قرض دئے تھے ان کے پانچ لے لو اور کیا کرو گے؟ مگر نہیں شاید اتنی بددیانتی کرنے کی مجھ میں جرات نہ تھی۔ اگر دیتا بھی تو خوش معاملگی سے نہیں بلکہ بدنامی اور تشہیر کے

خوف سے۔ ایک دن ہم دونوں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ یکایک بکرم نے کہا "ہمارا ٹکٹ نکل آئے' مجھے دل میں یہ افسوس ضرور ہو گا کہ ناحق تم سے ساجھا کیا۔"

میں نے چونک کر کہا "اچھا' مگر اسی طرح کیا مجھے افسوس نہیں ہو سکتا؟"

"لیکن ٹکٹ تو میرے نام کا ہے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔"

"اچھا مان لو' میں کہہ دوں' تم نے ٹکٹ میں ساجھا ہی نہیں کیا۔"

"میرے خون کی حرکت بند ہو گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔"

"میں تمہیں اتنا بدنیت نہیں سمجھتا۔"

"مگر ہے بہت ممکن' پانچ لاکھ' سوچو۔"

"تو آؤ لکھا پڑھی کر لو' جھگڑا کیوں رہے۔"

بکرم نے ہنس کر کہا۔ "تم بڑے شکی ہو یار" میں تمہارا امتحان لے رہا تھا۔ بھلا ایسا کہیں ہو سکتا ہے۔ پانچ لاکھ نہیں پانچ کروڑ کا معاملہ ہو تب بھی ایشور چاہے گا تو نیت میں فتور نہ آنے دوں گا۔"

مگر مجھے ان اعتماد انگیز باتوں سے تشفی نہ ہوئی' دل میں ایک تشویش آگ کی چنگاری کی طرح سلگنے لگی۔ کہیں سچ مچ انکار کر جائے تو کہیں کا نہ رہوں۔

میں نے کہا "یہ تو میں جانتا ہوں کہ تمہاری نیت میں فتور نہیں آ سکتا۔ لیکن تحریر سے پابند ہو جانے میں کیا حرج ہے؟"

"فضول ہے۔"

"فضول ہی سہی۔"

"تو پکے کاغذ پر لکھنا پڑے گا۔ دس لاکھ کی کورٹ فیس ہی دس ہزار ہو جائے گی کس خیال میں ہو آپ۔"

میں نے تامل کر کے کہا۔ "مجھے سادے کاغذ ہی سے اطمینان ہو جائے گا۔"

"جس معاہدے کی کوئی قانونی اہمیت نہ ہو' اسے لکھ کر کیوں وقت ضائع کریں؟"

"قانونی اہمیت نہ ہو' اخلاقی اہمیت تو ہے۔"

"اچھا لکھ دوں گا' جلدی کیا ہے۔"

مجھے دال میں کچھ کالا نظر آیا' بگڑ کر بولا "تمہاری نیت تو ابھی سے بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

"تو کیا تم ثابت کرنا چاہتے ہو کہ ایسی حالت میں تمہاری نیت فاسد نہ ہو جاتی۔"

"میری نیت اتنی کمزور نہیں ہے۔"

"اجی رہنے بھی دو بڑے نیت والے دیکھے ہیں۔"

مجھے اپنے اوپر اعتبار نہیں رہا۔ "میں تم سے معاہدہ لکھوا کر چھوڑوں گا چاہے دوستی کا خاتمہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔"

بڑے نشست خانے میں جہاں دونوں ٹھاکر بیٹھا کرتے تھے' اسی طرح کا مناظرہ چھڑا ہوا تھا۔ جھڑپ کی آواز سن کر ہمارا دھیان ادھر لگا۔ دیکھا تو دونوں بھائیوں میں ہاتھا پائی ہو رہی ہے۔ سچ مچ اپنی کرسیوں سے اٹھ کر پینترے بدل رہے تھے۔

چھوٹے نے کہا "مشترکہ خاندان میں کسی کے نام سے روپیہ آئے' ان پر سب کا مساوی حق ہے۔"

بڑے ٹھاکر نے بگڑ کر جواب دیا "ہرگز نہیں' جا کر قانون دیکھو اگر میں کوئی جرم کروں تو مجھے سزا ہو گی۔ مشترکہ خاندان کو نہیں' یہ انفرادی معاملہ ہے۔"

"اس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔"

"شوق سے عدالت جائیے' اگر میرے لڑکے کی بیوی یا خود میرے نام لاٹری نکلی تو آپ کو اس سے کوئی تعلق نہ ہو گا' جیسے آپ کے نام لاٹری نکلے تو مجھ سے یا میری لڑکی سے یا میری بیوی سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔"

"اگر میں جانتا۔ آپ یہ پہلو اختیار کریں گے تو اپنی بیوی بچوں کے نام سے ٹکٹ لے لیتا۔"

"تو یہ آپ کا قصور ہے۔"

"اسی لئے مجھے خیال تھا کہ آپ میرے حقیقی بھائی ہیں اور ایک جا معاملہ ہے۔"

"یہ جوا ہے' یہ آپ کو سمجھ لینا چاہئے۔"

بکرم کی ماں نے دونوں بھائیوں کو شمشیر بکف دیکھا تو دوڑی ہوئی باہر آئیں اور دونوں کو سمجھانے لگیں۔

چھوٹے ٹھاکر صاحب بھرائی ہوئی آواز میں بولے "آپ مجھے کیا سمجھاتی ہیں انہیں سمجھائیے جو بھائی کی گردن پر چھری پھیر رہے ہیں۔ آپ کے پاس چار ٹکٹ ہیں میرے پاس صرف ایک' میرے مقابلے میں آپ لوگوں کو روپے ملنے کا چوگنا چانس ہے۔"

بڑے ٹھاکر سے نہ رہا گیا بولے "ہم نے بیس روپے نہیں دئے ٹھنا ٹھن۔"

اماں نے انہیں ملامت کے انداز میں دیکھا' اور چھوٹے ٹھاکر صاحب کو ٹھنڈا کیا بولیں۔ "تم میرے روپے سے آدھے لے لینا۔ میں اپنے بیٹے..."

بڑے ٹھاکر نے زبان پکڑ لی' "کیوں واہیات قسم کھا رہی ہو' وہ کیوں آدھا لے لیں گے۔ میں ایک دھیلہ بھی نہیں چھونے دوں گا۔ اگر ہم انسانیت سے کام لیں تو بھی انہیں پانچویں حصے سے زائد کسی طرح نہ ملے گا۔ آدھے کا دعوا کس بنا پر ہو سکتا ہے۔"

چھوٹے ٹھاکر صاحب نے خونی نظروں سے دیکھا۔ "ساری دنیا کا قانون آپ ہی جانتے ہیں۔"

"جانتے ہیں۔ بیس سال تک وکالت نہیں کی ہے؟"

"یہ وکالت نکل جائے گی۔ جب سامنے کلکتہ کا بیرسٹر کھڑا کر دوں گا؟"

"بیرسٹر کی ایسی تیسی۔"

"اچھا زبان سنبھالئے میں نصف لوں گا۔ اسی طرح جیسے گھر کی جائداد میں میرا نصف ہے۔"

بڑے ٹھاکر صاحب کوئی توپ چھوڑنے والے ہی تھے کہ مسٹر پرکاش سر اور ہاتھ

میں پٹی باندھے خوش خوش لنگڑاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ بڑے ٹھاکر صاحب نے گھبرا کر پوچھا "یہ تمہیں کیا ہو گیا' ارے یہ چوٹ کیسی' یہ کسی سے جھگڑا ہوا۔ کہیں گر پڑے۔ اے منگوا جا تو ڈاکٹر کو بلا لا۔"

اماں جی نے پرکاش کو ایک کرسی پر لٹا دیا اور وفود شک سے کچھ پوچھ نہ سکتیں تھیں۔

پرکاش نے کراہ کر حسرت ناک لہجے میں کہا "کچھ نہیں' ایسی کچھ چوٹ نہیں لگی۔" بڑے ٹھاکر صاحب جو غم و غصہ سے کانپ رہے تھے۔ کہا "کیسے کہتے ہو چوٹ نہیں لگی۔ سارا ہاتھ اور سر سوج گیا ہے۔ کہتے ہیں چوٹ نہیں لگی۔ کس سے جھگڑا ہوا' کیا معاملہ ہے۔ بتلاتے کیوں نہیں۔ میں جا کر تھانے میں رپٹ کرتا ہوں۔"

"آپ ناحق گھبراتے ہیں بہت معمولی چوٹ ہے دو چار روز میں اچھی ہو جائے گی۔" اس کے چہرے پر اب بھی ایک مسرت آمیز امید جھلک رہی تھی۔ ندامت غصہ یا انتقام کی خواہش کا نام تک نہ تھا۔

اماں نے آواز کو سنبھال کر پوچھا' "بھگوان کریں جلد اچھے ہو جاؤ۔ لیکن چوٹ لگی کیسے کیا کسی تانگہ پر سے گر پڑے۔"

پرکاش نے درد سے ناک سکوڑ کر مسکراتے ہوئے کہا' "کچھ نہیں نہ کسی تانگہ سے' نہ کسی سے جھگڑا ہوا۔ ذرا جھگڑا بابا کے پاس چلا گیا تھا۔ یہ انہی کی دعا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں وہ آدمیوں کی صورت سے بھاگتے ہیں اور پتھر مارنے دوڑتے ہیں' جو دوڑ کر بھاگا وہ نامراد رہ جاتا ہے جو پتھر کی چوٹیں کھا کر بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا اس کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ بس یہی سمجھ لیجئے' چوٹ کھائی اور پاس ہوئے۔ آج میں وہاں پہنچا تو ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ کوئی مٹھائیاں لئے کوئی پھولوں کی مالا' کوئی شال دوشالے جھگڑا بابا استغراق کی حالت میں بیٹھے تھے۔ یکایک انہوں نے آنکھیں کھولیں اور یہ مجمع دیکھا تو گالیاں بکتے ہوئے کئی پتھر اٹھا کر دوڑے۔ مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ گرتے پڑتے بھاگے لیکن بندہ وہاں قطب مینار کی طرح ڈٹا رہا۔ بس انہوں نے پتھر

چلا ہی تو دیا۔ پہلا پتھر سر میں لگا کھوپڑی بھنا گئی' معلوم ہوا جیسے گولا لگ گیا ہو۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دوسرا پتھر ہاتھ میں لگا' میں وہیں ڈھیر ہو گیا۔ بابا گالیاں بکتے ہوئے لوٹ گئے ادھر گھنٹہ بھر تک مجھ سے اٹھا ہی نہ گیا آخر ہمت باندھ کر اٹھا اور ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا اور انہوں نے کہا فریکچر ہو گیا ہے' پٹی باندھ دی۔ بڑی شدت کا درد ہے مگر مراد پوری ہو گئی اب لاٹری میرے نام آئی رکھی ہے۔ مطلق شبہ نہیں سب سے پہلے جھگڑا بابا کی کٹی بنواؤں گا۔ ان کی مار کھا کر آج تک کوئی نامراد نہیں لوٹا۔"

بڑے ٹھاکر صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اماں جی کا اندیشہ بھی دور ہو گیا' سر پھٹا تو کیا ہوا۔ ہاتھ بھی ٹوٹا تو کیا غم ہے لاٹری تو اپنی ہو گی۔

شام ہو گئی تھی' بڑے ٹھاکر صاحب مندر کی طرف چلے گئے' بھگوت سننے کا وقت آ گیا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر صاحب وہیں بیٹھے رہے ان کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ بولے "جھگڑا بابا تو وہیں رہتے ہیں ندی کے کنارے نیچے میں۔"

پرکاش نے بے اعتنائی سے کہا "جی ہاں"

"کیا بہت زور سے مارتے ہیں؟"

پرکاش نے ان کا عندیہ سمجھ لیا۔

"آپ زور سے کہتے ہیں' ارے صاحب ایسا پتھر مارتے ہیں کہ بم کے گولے سا لگتا ہے۔ دیو ساتھ ہے اور شہ زور اتنے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ شیروں کو گھونسے میں مار ڈالتے ہیں۔ اف سر پھٹا جا رہا ہے۔ ان کا نشانہ ایسا بے خطا ہوتا ہے کہ آدمی بچ ہی نہیں سکتا ایک دو پتھر سے زیادہ کھانے کی کسی میں تاب ہی نہیں۔ جب تک گر نہ پڑیں مگر راز یہی ہے کہ آپ جتنے زیادہ پتھر کھائیں گے اتنا ہی اپنے مقصد کے قریب پہنچیں گے۔ ایک چوٹ کھا کر جان بچانے کے لئے کوئی بہانہ کر کے گر پڑے تو اس کا پھل بھی اتنا ہی ملتا ہے۔ آدھا یا اس سے کم۔ میں نے تو ٹھان لیا تھا کہ چاہے مر ہی جاؤں لیکن جب تک نہ گر پڑوں پیچھا نہ چھوڑوں گا۔"

پرکاش نے ایسا ہیبت ناک مرقع کھینچا کہ چھوٹے ٹھاکر صاحب کانپ گئے جھگڑا بابا کی کٹیا میں جانے کی ہمت نہ پڑی۔

آخر جولائی کی بیسویں تاریخ آئی' سویرے ہی ڈاک خانے کے سامنے کئی ہزار آدمیوں کا مجمع ہو گیا۔ تار کا انتظار ہونے لگا۔ دونوں ٹھاکروں نے گھڑی رات رہے گنگا اشنان کیا اور مندر میں پوجا کر کے ہم دونوں ساجھے داروں نے اپنا اپنا کام تقسیم کر لیا۔ بکرم تو ڈاک خانہ گیا۔ میں مندر میں دیوتاؤں کے قدموں میں جا بیٹھا۔ دونوں ٹھاکر بھی بیٹھے پوجا کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ بالکل بچوں کی سی کیفیت تھی' جو ذرا سی بات میں ہنس دیتے ہیں اور ذرا سی بات میں رو دیتے ہیں۔

بڑے ٹھاکر نے پوچھا' "بھگوان تو اپنے بھگتوں پر بڑی دیا رکھتے ہیں۔ کیوں پجاری جی؟" پجاری نے فرمایا "ہاں سرکار!"

"گج (ا) کو گراہ کے منہ سے بچانے کے لئے بھگوان چھیر ساگر سے دوڑے تھے۔ چھوٹے ٹھاکر نے پوچھا "بھگوان تو انتر جامی ز عالم الغیب ہیں' کس میں کتنی بھگتی ہے' یہ کیا ان سے چھپا رہتا ہے۔"

پجاری نے فرمایا "نہیں سرکار ان سے کیا چھپا ہے۔"

ادھر پوجا ہو رہی تھی۔ ادھر مندر کے باہر مساکین کو غلہ تقسیم کیا جا رہا تھا۔

بڑے ٹھاکر نے پوچھا۔ "تمہارا دل کیا چاہتا ہے پجاری جی۔"

پجاری نے فرمایا "آپ کی جیتے (فتح) ہو گی، سرکار۔"

چھوٹے سرکار نے پوچھا "اور میری۔"

پجاری نے بے تکلف کہا "آپ کی بھی جیتے ہو گی۔"

دونوں آدمیوں کی فتح کیسے ہو گی' اس پر غور کرنے کی وہاں کسے فرصت تھی۔ کتھا ختم ہو گئی تو بڑے ٹھاکر صاحب نشہ عقیدت سے سرشار مندر سے نکلے' بھجن

گاتے ہوئے۔

سو میں تو تیری چرنوں میں آیا

چھوٹے ٹھاکر صاحب بھبھوت لپیٹے حمد و ثنا میں مصروف تھے۔

پیروں تلے بچھایا کیا خوب فرش خاکی
اور سر پر لا جور کیا آسمان بنایا
زندگی میں جب تیرا ہم کو ہمیشہ تھا خیال
بعد مردن بھی ہوس دل میں وہی لے جائیں گے

پرکاش بابو پٹیاں باندھے غریبوں کو غلہ بانٹ رہے تھے۔ اور بار بار فون پر جا کر پوچھتے کیا خبر ہے ہر شخص کے چہرے پر امید و بیم کا رنگ تھا۔ امید رگوں میں' آنکھوں میں' ہر شخص میں اڈی پڑی تھی۔ اور ہمارے دل میں دماغ میں' جگر میں رعشہ پیدا کر رہا تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی زور سے بجی سب کے سب دوڑے' رسیور بکرم کے ہاتھ لگا "کون ہے؟"

"میں ہوں بکرم۔"

"کیا خوشخبری ہے۔"

"اس شہر کا صفایا ہے' شہر ہی کافی نہیں' سارے ہندوستان کا' امریکہ کے ایک آدمی کا نام آیا ہے۔"

پرکاش بابو زمین پر گر پڑے۔ بڑے ٹھاکر صاحب پر جیسے فالج گر گیا ہو۔ بے حس و حرکت نقش دیوار کی طرح کھڑے رہ گئے۔ چھوٹے ٹھاکر صاحب سر پیٹ کر رونے لگے۔

رہا میں' مجھے مایوسی کے ساتھ ایک حاسدانہ مسرت ہو رہی تھی کہ مجھے بکرم کی خوشامد کرنے کی ذلت نہیں اٹھانی پڑی۔ اماں جان باہر نکل آئیں اور کہہ رہی تھیں سبھوں نے بے ایمانی کی' کون وہاں دیکھنے گیا تھا۔

اس روز رات کو کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ بڑے ٹھاکر صاحب نے پجاری جی پر غصہ

اتارا اور انہیں برخاست کر دیا اسی لئے تمہیں اتنے دنوں سے پال رکھا ہے حرام کا مال کھاتے ہو اور چین کرتے ہو۔

اتنے میں بکرم رونی صورت لئے آکر بیٹھ گیا۔

میں نے پوچھا۔ "اب معاملہ ختم ہو گیا' مگر سچ کہنا' تمہاری نیت فاسد تھی یا نہیں؟"

بکرم بے غیرتی کے ساتھ مسکرا پڑا۔

"اب کیا کرو گے پوچھ کر' پردہ ڈھکا رہنے دو۔"

(۱) روایت ہے کہ ایک بار ہاتھی (گج) ندی میں پانی پینے گیا۔ ندی میں ایک مگرمچھ تھا اس نے ہاتھی کی ٹانگ پکڑ لی۔ ہاتھی نے تب بھگوان کی یاد کی اور بھگوان نے اپنی جائے قیام چھیر ساگر اودھ کے سمندر سے ہاتھی کی مدد کی۔

شکوہ شکایت

زندگی کا بڑا حصہ تو اسی گھر میں گزر گیا مگر کبھی آرام نہ نصیب ہوا۔ میرے شوہر دنیا کی نگاہ میں بڑے نیک اور خوش خلق اور فیاض اور بیدار مغز ہوں گے۔ لیکن جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔ دنیا کو تو ان لوگوں کی تعریف میں مزا آتا ہے جو اپنے گھر کو جہنم میں ڈال رہے ہوں اور غیروں کے پیچھے اپنے آپ کو تباہ کئے ڈالتے ہوں۔ جو گھر والوں کے لئے مرتا ہے اس کی تعریف دنیا والے نہیں کرتے۔ وہ تو ان کی نگاہ میں خود غرض ہے' بخیل ہے' تنگ دل ہے مغرور ہے' کور باطن ہے۔ اسی طرح جو لوگ باہر والوں کے لئے مرتے ہیں ان کی تعریف گھر والے کیوں کرنے لگے۔ اب انہیں کو دیکھو' صبح سے شام تک مجھے پریشان کیا کرتے ہیں۔ باہر سے کوئی چیز منگواؤ تو ایسی دکان سے لائیں گے جہاں کوئی گاہک بھول کر بھی نہ جاتا ہو۔ ایسی دکانوں پر نہ چیز اچھی ملتی ہے نہ وزن ٹھیک ہوتا ہے۔ نہ دام ہی مناسب۔ یہ نقائص نہ ہوتے تو وہ

دکان بدنام ہی کیوں ہوتی۔ انہیں ایسی ہی دکانوں سے سودا سلف خریدنے کا مرض ہے۔ بارہا کہا کسی چلتی ہوئی دکان سے چیزیں لایا کرو وہاں مال زیادہ کھپتا ہے اس لئے تازہ مال آتا رہتا ہے۔ مگر نہیں ٹٹ پونجیوں سے ان کو ہمدردی ہے اور وہ انہیں الٹے استرے سے مونڈتے ہیں۔ گیہوں لائیں گے تو سارے بازار سے خراب گھنا ہوا' چاول ایسا موٹا کہ بیل بھی نہ پوچھے۔ دال میں کنکر بھرے ہوئے۔ منوں لکڑی جلا ڈالو' کیا مجال کہ گلے۔ گھی لائیں گے تو آدھوں آدھ تیل' اور نرخ اصلی گھی سے ایک چھٹانک کم۔ تیل لائیں گے تو ملاوٹ کا۔ بالوں میں ڈالو تو چکٹ جائیں' مگر دام دے آئیں گے اعلیٰ درجے کے چنبیلی کے تیل کے۔ چلتی ہوئی دکان پر جاتے تو جیسے انہیں ڈر لگتا ہے۔ شاید اونچی دکان اور پھیکے پکوان کے قائل ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ نیچی دکان پر سڑے پکوان ہی ملتے ہیں۔

ایک دن کی بات ہو تو برداشت کر لی جائے۔ روز روز کی یہ مصیبت برداشت نہیں ہوتی ہیں کہتی ہوں آخر ٹٹ پونجیوں کی دکان پر جاتے ہی کیوں ہیں۔ کیا ان کی پرورش کا ٹھیکہ تمہیں نے لے لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں مجھے دیکھ کر بلانے لگتے ہیں۔ خوب! ذرا انہیں بلا لیا اور خوشامد کے دو چار الفاظ سنا دئے' بس آپ کا مزاج آسمان پر جا پہنچا۔ پھر انہیں سدھ نہیں رہتی کہ وہ کوڑا کرکٹ باندھ رہا ہے یا کیا۔ پوچھتی ہوں تم اس راستے سے جاتے ہی کیوں ہو؟ کیوں کسی دوسرے راستے سے نہیں جاتے؟ ایسے اٹھائی گیروں کو منہ ہی کیوں لگاتے ہو؟ اس کا کوئی جواب نہیں۔ ایک خموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔

ایک بار ایک زیور بنوانا تھا۔ میں تو حضرت کو جانتی تھی۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی ایک پہچان کے سنار کو بلا رہی تھی۔ اتفاق سے آپ بھی موجود تھے۔ بولے یہ فرقہ بالکل اعتبار کے قابل نہیں دھوکا کھاؤ گی۔ میں ایک سنار کو جانتا ہوں۔ میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے۔ برسوں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں۔ میرے ساتھ چالبازی نہیں کر سکتا۔ میں نے سمجھا جب ان کا دوست ہے اور وہ بھی بچپن کا' تو کہاں تک دوستی کا

حق نہ نبھائے گا۔ سونے کا ایک زیور اور پچاس روپے ان کے حوالے کئے۔ اور اس بھلے آدمی نے وہ چیز اور روپے نہ جانے کس بے ایمان کو دے دئے کہ برسوں کے پیہم تقاضوں کے بعد جب چیز بن کر آئی تو روپے میں آٹھ آنے تانبا' اور اتنی بد نما کہ دیکھ کر گھن آتی تھی' برسوں کا ارمان خاک میں مل گیا۔ روپیٹ کر بیٹھ رہی۔ ایسے ایسے وفادار تو ان کے دوست ہیں جنہیں دوست کی گردن پر چھری پھیرنے میں عار نہیں۔ ان کی دوستی بھی انہیں لوگوں سے ہے جو زمانہ بھر کے فاقہ مست' قلانچ' بے سرو سامان ہیں' جن کا پیشہ ہی ان جیسے آنکھ کے اندھوں سے دوستی کرنا ہے۔ روز ایک نہ ایک صاحب مانگنے کے لئے سر پر سوار رہتے ہیں اور بلا لئے گلا نہیں چھوڑتے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے روپے ادا کئے ہوں۔ آدمی ایک بار کھو کر سیکھتا ہے' دو بار کھو کر سیکھتا ہے' مگر یہ بھلے مانس ہزار بار کھو کر بھی نہیں سیکھتے۔ جب کہتی ہوں روپے تو دے آئے اب مانگ کیوں نہیں لاتے۔ کیا مر گئے تمہارے دوست؟ تو بس بغلیں جھانک کر رہ جاتے۔ آپ سے دوستوں کو سوکھا جواب نہیں دیا جاتا۔ خیر سوکھا جواب نہ دو میں یہ بھی نہیں کہتی کہ دوستوں سے بے مروتی کرو۔ مگر ٹال تو سکتے ہو۔ کیا بہانے نہیں بنا سکتے ہو؟ مگر آپ انکار نہیں کر سکتے۔ کسی دوست نے کچھ طلب کیا اور آپ کے سر پر بوجھ پڑا بے چارے کیسے انکار کریں۔ آخر لوگ جان جائیں گے یہ حضرت بھی فاقہ مست ہیں۔ دنیا انہیں امیر سمجھتی ہے چاہے میرے زیور ہی کیوں نہ گروی رکھنے پڑیں۔ سچ کہتی ہوں بعض اوقات ایک ایک پیسے کی تنگی ہو جاتی ہے اور اس بھلے آدمی کو روپے جیسے گھر میں کاٹتے ہیں۔ جب تک روپے کے وارے نیارے نہ کر لے اسے کسی پہلو قرار نہیں۔ ان کے کرتوت کہاں تک کہوں۔ میرا تو ناک میں دم آ گیا۔ ایک نہ ایک مہمان روز بلائے بے درماں کی طرح سر پر سوار۔ نہ جانے کہاں کے بے فکرے ان کے دوست ہیں۔ کوئی کہیں سے آ کر مرتا ہے' کوئی کہیں سے۔ گھر کیا ہے اپاہجوں کا اڈا ہے۔ ذرا سا گھر' مشکل سے دو تو چارپائیاں' اوڑھنا بچھونا بھی بافراط نہیں مگر آپ ہیں کہ دوستوں کو دینے کے لئے تیار۔ آپ تو مہمان

کے ساتھ لینیں گے۔ اس لئے انہیں چارپائی بھی چاہئے۔ اوڑھنا بچھونا بھی چاہئے ورنہ گھر کا پردہ کھل جائے' جاتی ہے تو میرے اور بچوں کے سر۔ زمین پر پڑے سکڑ کر رات کاٹتے ہیں' گرمیوں میں تو خیر مضائقہ نہیں لیکن جاڑوں میں تو بس قیامت ہی آ جاتی ہے۔ گرمیوں میں بھی کھلی چھت پر تو مہمانوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اب میں بچوں کے لئے قفس میں پڑی تڑپا کروں۔ اتنی سمجھ بھی نہیں کہ جب گھر کی یہ حالت ہے تو کیوں ایسوں کو مہمان بنائیں جن کے پاس کپڑے لتے تک نہیں۔ خدا کے فضل سے ان کے سبھی دوست ایسے ہی ہیں۔ ایک بھی خدا کا بندہ ایسا نہیں' جو ضرورت کے وقت ان کے دھیلے سے بھی مدد کر سکے۔ دو ایک بار حضرت کو اس کا تجربہ اور بے حد تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ مگر اس مرد خدا نے تو آنکھیں کھولنے کی قسم کھالی ہے۔ ایسے ہی ناداروں سے ان کی پٹتی ہے' ایسے ایسے لوگوں سے آپ کی دوستی ہے کہ کہتے شرم آتی ہے۔ جسے کوئی اپنے دروازے پر کھڑا بھی نہ ہونے دے' وہ آپ کا دوست ہے' شہر میں اتنے امیر کبیر ہیں آپ کا کسی سے بھی ربط ضبط نہیں' کسی کے پاس نہیں جاتے۔ امرا مغرور ہیں' مدمغ ہیں' خوشامد پسند ہیں' ان کے پاس کیسے جائیں' دوستی گانٹھیں گے ایسوں سے جن کے گھر میں کھانے کو بھی نہیں۔

ایک بار ہمارا خدمت گار چلا گیا اور کئی دن دوسرا خدمت گار نہ ملا۔ میں کسی ہوشیار اور سلیقہ مند نوکر کی تلاش میں تھی مگر بابو صاحب کو جلد سے جلد کوئی آدمی رکھ لینے کی فکر سوار ہوئی۔ گھر کے سارے کام بدستور چل رہے تھے مگر آپ کو معلوم ہو رہا تھا کہ گاڑی رکی ہوئی ہے۔ ایک دن جانے کہاں سے ایک بانگڑو کو پکڑ لائے۔ اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ کوئی جانگلو ہے مگر آپ نے اس کی ایسی ایسی تعریفیں کیں کہ کیا کہوں! بڑا فرماں بردار ہے' پرلے سرے کا ایمان دار بلا کا محنتی' غضب کا سلیقہ شعار اور انتہا درجہ کا باتمیز۔ خیر میں نے رکھ لیا۔ میں بار بار کیوں کر ان کی باتوں میں آ جاتی ہوں' مجھے خود تعجب ہے۔ یہ آدمی صرف شکل سے آدمی تھا آدمیت کی کوئی علامت اس میں نہ تھی۔ کسی کام کی تمیز نہیں۔ بے ایمان نہ تھا مگر احمق اول

نمبر کا۔ بے ایمان ہوتا تو کم سے کم اتنی تسکین تو ہوتی کہ خود کھاتا ہے۔ کم بخت دکان داروں کی فطرتوں کا شکار ہو جاتا تھا اسے دس تک گنتی بھی نہ آتی تھی۔ ایک روپیہ دے کر بازار بھیجوں تو شام تک حساب نہ سمجھا سکے۔ غصہ پی پی کر رہ جاتی تھی۔ خون جوش کھانے لگتا تھا کہ سور کے کان اکھاڑ لوں۔ مگر ان حضرت کو کبھی اسے کچھ کہتے نہیں دیکھا۔ آپ نہا کر دھوتی چھانٹ رہے ہیں اور وہ دور بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے۔ میرا خون کھولنے لگتا۔ لیکن انہیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا جب میرے ڈانٹنے پر دھوتی چھانٹنے جاتا بھی تو آپ اسے قریب نہ آنے دیتے۔ اس کے عیبوں کو ہنر بنا کر دکھایا کرتے تھے اور اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے تو ان عیوب پر پردہ ڈال دیتے تھے۔ کم بخت کو جھاڑو دینے کی بھی تمیز نہ تھی۔ مردانہ کمرہ ہی تو سارے گھر میں ڈھنگ کا ایک کمرہ ہے' اس میں جھاڑو دیتا تو ادھر کی چیز ادھر' اوپر کی نیچے گویا سارے کمرے میں زلزلہ آگیا ہو اور گرد کا یہ عالم کہ سانس لینی مشکل مگر آپ کمرے میں اطمینان سے بیٹھے رہتے۔ گویا کوئی بات ہی نہیں۔ ایک دن میں نے اسے خوب ڈانٹا اور کہہ دیا "اگر کل سے تو نے سلیقے سے جھاڑو نہ دی تو کھڑے کھڑے نکال دوں گی۔" سویرے سو کر اٹھتی تو دیکھتی ہوں کمرے میں جھاڑو دی ہوئی ہے۔ ہر ایک چیز قرینے سے رکھی ہے۔ گرد و غبار کا کہیں نام نہیں۔ آپ نے فوراً" ہنس کر کہا "دیکھتی کیا ہو۔ آج گھورے نے بڑے سویرے جھاڑو دی ہے۔ میں نے سمجھا دیا تم طریقہ تو بتلاتی نہیں ہو' الٹی ڈانٹنے لگتی ہو۔" لیجئے صاحب یہ بھی میری ہی خطا تھی۔ خیر' میں نے سمجھا اس نالائق نے کم سے کم ایک کام تو سلیقے کے ساتھ کیا۔ اب روز کمرہ صاف ستھرا ملتا' اور میری نگاہوں میں گھورے کی کچھ وقعت ہونے لگی' اتفاق کی بات ایک دن میں ذرا معمول سے سویرے اٹھ بیٹھی اور کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ گھورے دروازے پر کھڑا ہے اور خود بدولت بڑی تن دہی سے جھاڑو دے رہے ہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ ان کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور گھورے کے سر پر پٹک دی۔ حرام خود کو اسی وقت دھتکار بتائی۔ آپ فرمانے لگے اس کی تنخواہ تو بیباق کر

دو۔ خوب! ایک تو کام نہ کرے دوسرے آنکھیں دکھائے۔ اس پر تنخواہ بھی دے دوں۔ میں نے ایک کوڑی بھی نہ دی۔ ایک کرتا دیا تھا وہ بھی چھین لیا۔ اس پر حضرت کئی دن مجھ سے روٹھے رہے۔ گھر چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے بڑی مشکلوں سے رکے۔

ایک دن مہتر نے اتارے کپڑوں کا سوال کیا۔ اس بے کاری کے زمانے میں فالتو کپڑے کس کے گھر میں ہیں۔ رئیسوں کے گھر میں ہوں۔ میرے یہاں تو ضروری کپڑے بھی نہیں۔ حضرت ہی کا توشہ خانہ ایک بقچی میں آ جائے گا جو ڈاک کے پارسل سے کہیں بھیجا جا سکتا ہے۔ پھر اس سال سردی کے موسم میں نئے کپڑے بنوانے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ میں نے مہتر کو صاف جواب دے دیا۔ سردی کی شدت تھی اس کا مجھے خود احساس تھا۔ غریبوں پر کیا گزرتی ہے' اس کا بھی علم تھا۔ لیکن میرے یا آپ کے پاس افسوس کے سوا اور کیا علاج ہے۔ جب روسا اور امرا کے پاس ایک مال گاڑی کپڑوں سے بھری ہوئی ہے تو پھر غربا کیوں نہ برہنگی کا عذاب جھیلیں۔ خیر' میں نے تو اسے جواب دے دیا آپ نے کیا کیا' اپنا کوٹ اتار کر اس کے حوالے کر دیا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ حضرت کے پاس یہی ایک کوٹ تھا۔ یہ خیال نہ ہوا کہ پہنیں گے کیا۔ مہتر نے سلام کیا' دعائیں دیں اور اپنی راہ لی۔ آخر کئی دن سردی کھاتے رہے صبح کو گھومنے جایا کرتے تھے' وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ مگر دل بھی قدرت نے انہیں عجیب قسم کا دیا ہے! پھٹے پرانے کپڑے پہنتے آپ کو شرم نہیں آتی۔ میں تو کٹ جاتی ہوں۔ آپ کو مطلق احساس نہیں۔ کوئی ہنستا ہے تو ہنسے۔ آپ کی بلا سے۔ آخر مجھ سے دیکھا نہ گیا تو ایک کوٹ بنوا دیا۔ جی تو جلتا تھا کہ خوب سردی کھانے دوں مگر ڈری کہ کہیں بیمار پڑ جائیں تو اور بھی آفت آ جائے۔ آخر کام تو انہیں کو کرنا ہے۔

یہ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے کہ میں کتنا نیک نفس اور منکسر مزاج ہوں۔ شاید انہیں ان اوصاف پر ناز ہو۔ میں انہیں نیک نفس نہیں سمجھتی ہوں۔ یہ سادہ لوحی

ہے۔ سیدھی سادی حماقت۔ بس مہتر کو آپ نے اپنا کوٹ دیا اسی کو میں نے کئی بار رات شراب کے نشے میں بدمست جھومتے دیکھا ہے۔ اور آپ کو دکھا بھی دیا ہے۔ تو پھر دوسروں کی کج روی کا تاوان ہم کیوں دیں۔ اگر آپ نیک نفس اور فیاض ہوتے تو گھر والوں سے بھی تو فیاضانہ برتاؤ کرتے یا ساری فیاضی باہر والوں کے لئے ہی مخصوص ہے۔ گھر والوں کو اس کا عشر عشیر بھی نہ ملنا چاہئے؟ اتنی عمر گزر گئی مگر اس شخص نے کبھی اپنے دل سے میرے لئے ایک سوغات بھی نہ خریدی۔ بے شک جو چیز طلب کروں اسے بازار سے لانے میں انہیں کلام نہیں' مطلق عذر نہیں مگر روپیہ بھی دے دوں یہ شرط ہے۔ انہیں خود کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ یہ میں مانتی ہوں کہ بچارے اپنے لئے بھی کچھ نہیں لاتے۔ میں جو کچھ منگوا دوں اسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔ مگر انسان کبھی کبھی شوق کی چیزیں چاہتا ہی ہے' اور مردوں کو دیکھتی ہوں' گھر میں عورت کے لئے طرح طرح کے زیور' کپڑے' شوق سنگار کے لوازمات لاتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ رسم ممنوع ہے۔ بچوں کے لئے مٹھائی' کھلونے' باجے' بگل شاید اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہ لائے ہوں قسم سی کھالی ہے۔ اس لئے میں تو انہیں بخیل کہوں گی' مردہ دل ہی کہوں گی۔ فیاض نہیں کہہ سکتی۔ دوسروں کے ساتھ ان کا جو فیاضانہ سلوک ہے اسے میں حرص نمود اور سادہ لوحی پر محمول کرتی ہوں۔ آپ کی منکسر مزاجی کا یہ حال ہے کہ جس دفتر میں آپ ملازم ہیں اس کے کسی عہدہ دار سے آپ کا میل جول نہیں۔ افسروں کو سلام کرنا تو آپ کے آئین کے خلاف ہے۔ نذر یا ڈالی کی بات تو الگ ہے اور تو اور کبھی کسی افسر کے گھر جاتے ہی نہیں۔ اس کا خمیازہ آپ نہ اٹھائیں تو کون اٹھائے۔ اوروں کو رعایتی چھٹیاں ملتی ہیں' آپ کی تنخواہ کٹتی ہے۔ اوروں کی ترقیاں ہوتی ہیں آپ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ حاضری میں پانچ منٹ بھی دیر ہو جائے تو جواب طلب ہو جاتا ہے۔ بچارے جی توڑ کر کام کرتے ہیں۔ کوئی پیچیدہ' مشکل کام آ جائے تو انہیں کے سر منڈھا جاتا ہے۔ انہیں مطلق عذر نہیں۔ دفتر میں انہیں گھسو اور پسو وغیرہ خطابات بھی ملے ہوئے ہیں۔ مگر منزل کتنی ہی دشوار طے

کریں ان کی تقدیر میں وہی سوکھی گھاس لکھی ہے۔ یہ انکسار نہیں ہے۔ میں تو اسے زمانہ شناسی کا فقدان کہتی ہوں۔ آخر کیوں کوئی شخص آپ سے خوش ہو دنیا میں مروت اور رواداری سے کام چلتا ہے' اگر ہم کسی سے کھنچے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم سے نہ کھنچا رہے' پھر جب دل میں کبیدگی ہوتی ہے تو وہ دفتری تعلقات میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو ماتحت افسر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے' جس کی ذات سے افسر کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچتا ہے' جس پر اعتبار ہوتا ہے اس کا لحاظ وہ لازمی طور پر کرتا ہے۔ ایسے بے غرضوں سے کیوں کسی کو ہمدردی ہونے لگی۔ افسر بھی انسان ہیں۔ ان کے دل میں جو اعزاز و امتیاز کی ہوس ہوتی ہے وہ کہاں پوری ہو۔ جب اس کے ماتحت ہی فرنٹ رہیں۔ آپ نے جہاں ملازمت کی وہیں سے نکالے گئے۔ کبھی کسی دفتر میں سال دو سال سے زیادہ نہ چلے۔ یا تو افسروں سے لڑ گئے یا کام کی کثرت کی شکایت کر بیٹھے۔

آپ کو کنبہ پروری کا دعوی ہے۔ آپ کے کئی بھائی بھتیجے ہیں۔ وہ کبھی آپ کی بات بھی نہیں پوچھتے۔ مگر آپ برابر ان کا منہ تاکتے رہتے ہیں۔ ان کے ایک بھائی صاحب آج کل تحصیل دار ہیں۔ گھر کی جائیداد انہیں کی نگرانی میں ہے' وہ شان سے رہتے ہیں' موٹر خرید لی ہے۔ کئی نوکر ہیں' مگر یہاں بھولے سے بھی خط نہیں لکھتے۔ ایک بار ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہوئی' میں نے کہا اپنے برادر مکرم سے کیوں نہیں مانگتے۔ کہنے لگے کیوں انہیں پریشان کروں۔ آخر انہیں بھی تو اپنا خرچ کرنا ہے۔ کون سی ایسی بچت ہو جاتی ہو گی میں نے بہت مجبور کیا' تو آپ نے خط لکھا۔ معلوم نہیں خط میں کیا لکھا لیکن روپے نہ آنے تھے نہ آئے۔ کئی دنوں کے بعد میں نے پوچھا "کچھ جواب آیا حضور کے بھائی صاحب کے دربار سے؟" آپ نے ترش ہو کر کہا۔ "ابھی ایک ہفتہ تو خط بھیجے ہوا۔ ابھی کیا جواب آ سکتا ہے۔ ایک ہفتہ اور گزرا۔ اب آپ کا یہ حال ہے کہ مجھے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں عطا فرماتے۔ اتنے بشاش نظر آتے ہیں کہ کیا کہوں۔ باہر سے آتے ہیں تو خوش خوش۔ کوئی نہ کوئی شگوفہ لئے ہوئے۔ میری خوشامد بھی خوب ہو رہی ہے میرے میکے والوں کی بھی تعریف

ہو رہی ہے۔ میں حضرت کی چال سمجھ رہی تھی۔ یہ ساری دلجوئیاں محض اس لئے تھیں کہ آپ کے برادر مکرم کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھوں۔ سارے ملکی' مالی' اخلاقی' تمدنی مسائل میرے سامنے بیان کئے جاتے تھے' اتنی تفصیل اور شرح کے ساتھ کہ پروفیسر بھی دنگ رہ جائے۔ محض اس لئے کہ مجھے اس امر کی بابت کچھ پوچھنے کا موقع نہ ملے لیکن میں کیا چوکنے والی تھی' جب پورے دو ہفتے گزر گئے اور بیمہ کمپنی کے روپے روانہ کرنے کی تاریخ موت کی طرح سر پر آ پہنچی تو میں نے پوچھا کیا ہوا؟ تمہارے بھائی صاحب نے دہن مبارک سے کچھ فرمایا یا ابھی تک خط ہی نہیں پہنچا۔ آخر ہمارا حصہ بھی گھر کی جائیداد میں کچھ ہے یا نہیں؟ یا ہم کسی لونڈی باندی کی اولاد ہیں؟ پانچ سو روپے سال کا منافع نو دس سال قبل تھا' اب ایک ہزار سے کم نہ ہو گا۔ کبھی ایک جھنجی کوڑی بھی ہمیں نہ ملی۔ موٹے حساب سے ہمیں دو ہزار ملنا چاہئے۔ دو ہزار نہ ہو' ایک ہزار ہو' پانچ سو ہو' ڈھائی سو ہو' کچھ نہ ہو تو بیمہ کمپنی کے پریمیم بھرنے کو تو ہو۔ تحصیل دار کی آمدنی ہماری آمدنی سے چوگنی ہے' رشوتیں بھی لیتے ہیں۔ تو پھر ہمارے روپے کیوں نہیں دیتے۔ آپ ہیں ہیں' ہاں ہاں کرنے لگے۔ بچارے گھر کی مرمت کراتے ہیں۔ عزیز و اقارب کی مہمان داری کا بار بھی تو انہیں پر ہے۔ خوب! گویا جائداد کا منشا محض یہ ہے کہ اس کی کمائی اسی میں صرف ہو جائے۔ اس بھلے آدمی کو بہانے بھی گھڑنے نہیں آتے۔ مجھ سے پوچھتے میں ایک نہیں ہزار بتا دیتی۔ کہہ دیتے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا اثاثہ جل کر خاک ہو گیا۔ یا چوری ہو گئی۔ چور نے گھر میں تنکا تک نہ چھوڑا۔ یا دس ہزار کا غلہ خریدا تھا اس میں خسارہ ہو گیا۔ گھاٹے سے بیچنا پڑا۔ یا کسی سے مقدمہ بازی ہو گئی اس میں دیوالیہ پٹ گیا۔ آپ کو سوجھی بھی تو لچر سی بات۔ اس جولانی طبع پر آپ مصنف اور شاعر بھی بنتے ہیں۔ تقدیر ٹھونک کر بیٹھ رہی۔ پڑوس کی بی بی سے قرض لئے تب جا کر کہیں کام چلا۔ پھر بھی آپ بھائی بھتیجوں کی تعریف کے پل باندھتے ہیں تو میرے جسم میں آگ لگ جاتی ہے۔ ایسے برادران یوسف سے خدا بچائے۔

خدا کے فضل سے آپ کے دو بچے ہیں' دو بچیاں بھی ہیں۔ خدا کا فضل کہوں یا خدا کا قہر کہوں' سب کے سب اتنے شریر ہو گئے کہ معاذ اللہ۔ مگر کیا مجال کہ یہ بھلے مانس کسی بچے کو تیز نگاہ سے بھی دیکھیں۔ رات کے آٹھ بج گئے ہیں' بڑے صاحب زادے ابھی گھوم کر نہیں آئے میں گھبرا رہی ہوں۔ آپ اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جھلائی ہوئی آتی ہوں اور اخبار چھین کر کہتی ہوں "جا کر ذرا دیکھتے کیوں نہیں لونڈا کہاں رہ گیا۔ نہ جانے تمہارے دل میں کچھ قلق ہے بھی یا نہیں تمہیں تو خدا نے اولاد ہی ناحق دی۔ آج آئے تو خوب ڈانٹنا۔ "تب آپ بھی گرم ہو جاتے ہیں۔" ابھی تک نہیں آیا۔ بڑا شیطان ہے۔ آج بچو آتے ہیں تو کان اکھاڑ لیتا ہوں' مارے تھپڑوں کے کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ یوں بگڑ کر طیش کے عالم میں آپ اس کو تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ اتفاق سے آپ ادھر جاتے ہیں' ادھر لڑکا آ جاتا ہے۔ میں کہتی ہوں کدھر سے آ گیا۔ وہ بچارے تجھے ڈھونڈنے گئے ہوئے ہیں۔ دیکھنا آج کیسی مرمت ہوتی ہے۔ یہ عادت ہی چھوٹ جائے گی۔ دانت پیس رہے تھے آتے ہی ہوں گے۔ چھڑی بھی ہاتھ میں ہے۔ تم اتنے شریر ہو گئے ہو کہ بات نہیں سنتے۔ آج قدرو عافیت معلوم ہو گی۔ لڑکا سہم جاتا ہے اور لیمپ جلا کر پڑھنے لگتا ہے۔ آپ ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹتے ہیں۔ حیران و پریشان اور بدحواس' گھر میں قدم رکھتے ہی پوچھتے ہیں۔ "آیا کہ نہیں؟"

میں ان کا غصہ بھڑکانے کے ارادے سے کہتی ہوں۔ "آ کر بیٹھا تو ہے جا کر پوچھتے کیوں نہیں' پوچھ کر ہار گئی کہاں گیا تھا۔ کچھ بولتا ہی نہیں۔"

آپ گرج پڑتے ہیں۔ "منو یہاں آؤ۔"

لڑکا تھر تھر کانپتا ہوا آ کر آنگن میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دونوں بچیاں گھر میں چھپ جاتی ہیں کہ خدا جانے کیا آفت نازل ہونے والی ہے۔ چھوٹا بچہ کھڑکی سے چوہے کی طرح جھانک رہا ہے۔ آپ جامے سے باہر ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی ہے۔ میں بھی وہ غضب ناک چہرہ دیکھ کر پچھتانے لگتی ہوں کہ کیوں ان سے شکایت کی۔ آپ لڑکے کے

پاس جاتے ہیں مگر بجائے اس کے کہ چھڑی سے اس کی مرمت کریں آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بناوٹی غصے سے کہتے ہیں۔ "تم کہاں گئے تھے جی! منع کیا جاتا ہے۔ مانتے نہیں ہو۔ خبردار جو اب اتنی دیر کی۔ آدمی شام کو گھر چلا آتا ہے یا ادھر ادھر گھومتا ہے؟"

میں سمجھ رہی ہوں یہ تمہید ہے۔ قصیدہ اب شروع ہو گا' گریز تو بری نہیں لیکن یہاں تمہید ہی خاتمہ ہو جاتی ہے۔ بس آپ کا غصہ فرو ہو گیا۔ لڑکا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے اور غالباً" خوشی سے اچھلنے لگتا ہے۔

میں احتجاج کی صدا بلند کرتی ہوں۔ "تم تو جیسے ڈر گئے' بھلا دو چار تمانچے تو لگائے ہوتے اس طرح تو لڑکے شیر ہو جاتے ہیں۔ آج آٹھ بجے آیا ہے۔ کل نو بجے کی خبر لائے گا۔ اس نے بھی دل میں کیا سوچا ہو گا۔"

آپ فرماتے ہیں۔ "تم نے سنا نہیں میں نے کتنی زور سے ڈانٹا۔ بچے کی روح ہی فنا ہو گئی۔ دیکھ لینا جو پھر کبھی دیر میں آئے۔"

"تم نے ڈانٹا تو نہیں ہاں آنسو پونچھ دئے۔"

آپ نے ایک نئی اپج نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہو جاتے ہیں' آپ کے خیال میں لڑکوں کو آزاد رہنا چاہئے۔ ان پر کسی قسم کی بندش یا دباؤ نہ ہونا چاہئے۔ بندش سے آپ کے خیال میں لڑکے کی دماغی نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے' کبھی گولیاں' کبھی کنکوے۔ حضرت بھی انہیں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ چالیس سال سے تو متجاوز آپ کی عمر ہے مگر لڑکپن دل سے نہیں گیا۔ میرے باپ کے سامنے مجال تھی کوئی لڑکا کنکوا اڑا لے یا گلی ڈنڈا کھیل سکے۔ خون پی جاتے۔ صبح سے لڑکوں کو پڑھانے بیٹھ جاتے۔ اسکول سے جوں ہی لڑکے واپس آتے پھر لے بیٹھتے۔ بس شام کو آدھ گھنٹے کی چھٹی دیتے۔ رات کو پھر کام میں جوت دیتے۔ یہ نہیں کہ آپ تو اخبار پڑھیں اور لڑکے گلی گلی کی خاک چھانتے پھریں۔ کبھی آپ بھی سینگ کٹا کر بچھڑے بن جاتے ہیں لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے

باپ کا لڑکوں پر کیا رعب ہو سکتا ہے۔ ابا جان کے سامنے میرے بھائی سیدھے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی آواز سنتے ہی قیامت آ جاتی تھی۔ انہوں نے گھر میں قدم دیکھا اور خموشی طاری ہوئی۔ ان کے روبرو جاتے ہوئے لڑکوں کی جان نکلتی تھی اور اسی تعلیم کی برکت ہے کہ سبھی اچھے عہدوں پر پہنچ گئے۔ صحت البتہ کسی کی بہت اچھی نہیں ہے۔ تو ابا جان کی صحت ہی کون بہت اچھی تھی۔ بچارے ہمیشہ کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہتے۔ پھر لڑکوں کی صحت کہاں سے اچھی ہو جاتی لیکن کچھ بھی ہو تعلیم و تادیب میں انہوں نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی۔

ایک روز میں نے حضرت کو بڑے صاحب زادے کو کنکوا کی تعلیم دیتے دیکھا۔ یوں گھماؤ' یوں غوطہ دو' یوں کھینچو' یوں ڈھیل دو ایسا دل و جان سے سیکھا رہے تھے گویا گرو منتر دے رہے ہوں۔ اس دن میں نے بھی ان کی ایسی خبر لی کہ یاد کرتے ہوں گے۔ میں نے صاف کہہ دیا تم کون ہوتے ہو میرے بچوں کو بگاڑنے والے تمہیں گھر سے کوئی مطلب نہیں ہے نہ ہو' لیکن آپ میرے بچوں کو خراب مت کیجئے' برے برے شوق نہ پیدا کیجئے اگر آپ انہیں سدھار نہیں سکتے تو کم سے کم بگاڑئے مت' لگے باتیں بنانے' ابا جان کسی لڑکے کو میلے تماشے نہ لے جاتے تھے۔ لڑکا سر پٹک کر مر جائے مگر ذرا بھی نہ پسیجتے تھی اور ان بھلے آدمیوں کا یہ حال ہے کہ ایک سے پوچھ کر میلے لے جاتے ہیں۔ چلو چلو' وہاں بڑی بہار ہے' خوب آتش بازیاں چھوٹیں گی' غبارے اڑیں گے۔ ولایتی چرخیاں بھی ہیں ان میں مزے سے بیٹھنا اور تو اور آپ لڑکوں کو ہاکی کھیلنے سے بھی نہیں روکتے۔ یہ انگریزی کھیل بھی کتنے خوف ناک ہوتے ہیں کرکٹ' فٹ بال' ہاکی ایک سے ایک مہلک۔ گیند لگ جائے تو جان ہی لے کر چھوڑے۔ مگر آپ کو ان کھیلوں سے بڑی رغبت ہے۔ کوئی لڑکا میچ جیت کر آ جاتا تو کتنے خوش ہوتے ہیں' گویا کوئی قلعہ فتح کر آیا ہو۔ حضرت کو ذرا بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کسی لڑکے کے چوٹ لگ گئی تو کیا ہو گا۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹ گیا تو بچاروں کی زندگی کیسے پار لگے گی۔

پچھلے سال لڑکی کی شادی تھی۔ آپ کو یہ ضد تھی کہ جہیز کے نام کھوٹی کوڑی بھی نہ دیں گے۔ چاہے لڑکی ساری عمر کنواری بیٹھی رہے۔ آپ اہل دنیا کی خبیث النفسی آئے دن دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر بھی چشم بصیرت نہیں کھلتی۔ جب تک سماج کا یہ نظام قائم ہے اور لڑکی کا بلوغ کے بعد کنواری رہنا انگشت نمائی کا باعث ہے اس وقت تک یہ رسم فنا نہیں ہو سکتی۔ دو چار افراد بھلے ہی ایسے بیدار مغز نکل آئیں جو جہیز لینے سے انکار کریں لیکن اس کا اثر عام حالات پر کم ہوتا ہے۔ اور برائی بدستور قائم رہتی ہے۔ جب لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لئے بھی بیس پچیس برس کی عمر تک کنواری رہنا بدنامی کا باعث نہ سمجھا جائے گا اس وقت آپ ہی آپ یہ رسم رخصت ہو جائے گی۔ میں نے جہاں جہاں پیغام دئے۔ جہیز کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اور آپ نے ہر موقع پر ٹانگ اڑا دی۔ جب اس طرح ایک سال پورا گزر گیا اور لڑکی کا سترھواں سال شروع ہو گیا تو میں نے ایک جگہ بات پکی کر لی۔ حضرت بھی راضی ہو گئے کیوں کہ ان لوگوں نے قرار داد نہیں کی۔ حالانکہ دل میں انہیں پورا یقین تھا کہ ایک اچھی رقم ملے گی اور میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ اپنے مقدور بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھوں گی۔ شادی کے بخیر و عافیت انجام پانے میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن ان مہاشے کے آگے میری ایک نہ چلتی تھی۔ یہ رسم بے ہودہ ہے یہ رسم بے معنی ہے یہاں روپے کی کیا ضرورت؟ یہاں گیتوں کی کیا ضرورت؟ ناک میں دم تھا۔ یہ کیوں وہ کیوں یہ تو صاف جہیز ہے۔ تم نے میرے منہ میں کالک لگا دی میری آبرو مٹا دی۔ ذرا خیال کیجئے بارات دروازے پر پڑی ہوئی ۔ دن لڑکی کے ماں باپ برت رکھتے ہیں۔ میں نے بھی برت رکھا۔ لیکن آپ کو ضد تھی۔ کہ برت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب لڑکے کے والدین برت نہیں رکھتے تو لڑکی کے والدین کیوں رکھیں اور سارا خاندان ہرچند منع کرتا رہا لیکن آپ نے حسب معمول ناشتہ کیا' کھانا کھایا۔ خیر رات کو شادی کے وقت کنیا دان کی رسم آئی۔ آپ کو کنیا دان کی رسم پر ہمیشہ سے اعتراض ہے۔ اسے آپ مہمل سمجھتے ہیں۔ لڑکی دان کی چیز نہیں۔ دان روپے پیسے کا ہوتا ہے جانور بھی دان دئے جا سکتے ہیں لیکن لڑکی کا دان

ایک لچر سی بات ہے۔ کتنا سمجھاتی ہوں۔ "صاحب پرانا رواج ہے' شاستروں میں صاف اس کا حکم ہے۔ عزیز و اقارب سمجھا رہے ہیں مگر آپ ہیں کہ کان پر جوں نہیں رینگتی۔ کہتی ہوں دنیا کیا کہے گی؟ یہ لوگ کیا بالکل لا مذہب ہو گئے مگر آپ کان ہی نہیں دھرتے۔ پیروں پڑی' یہاں تک کہا کہ بابا تم کچھ نہ کرنا جو کچھ کرنا ہو گا میں کر لوں گی تم صرف چل کر منڈپ میں لڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ اور اسے دعا دو۔ مگر اس مرد خدا نے مطلق سماعت نہ کی۔ آخر مجھے رونا آگیا۔ باپ کے ہوتے میری لڑکی کا کنیا دان چچا یا ماموں کرے' یہ مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے تنہا کنیا دان کی رسم ادا کی آپ گھر جھانکے تک نہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ آپ ہی مجھ سے روٹھ بھی گئے۔ بارات کی رخصتی کے بعد مجھ سے مہینوں بولے نہیں۔ جھک مار کر مجھی کو منانا پڑا۔

مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے لئے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں انہیں پیار کرتی ہوں۔ ان میں وہ کون سی خوبی ہے جس پر میں فریفتہ ہوں۔ مجھے خود نہیں معلوم۔ مگر کوئی چیز ہے ضرور جو مجھے ان کا غلام بنائے ہوئے ہے۔ وہ ذرا معمول سے دیر میں گھر آتے ہیں تو میں بے صبر ہو جاتی ہوں۔ ان کا سر بھی درد کرے تو میری جان نکل جاتی ہے۔ آج اگر تقدیر ان کے عوض مجھے کوئی علم اور عقل کا پتلا' حسن اور دولت کا دیوتا بھی دے تو میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں۔ یہ فرض کی بیڑی نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ رواجی وفاداری بھی نہیں ہے بلکہ ہم دونوں کی فطرتوں میں کچھ ایسی رواداریاں کچھ ایسی صلاحیتیں پیدا ہو گئی ہیں گویا کسی مشین کے کل پرزے گھس گھسا کر فٹ گئے ہوں۔ اور ایک پرزے کی جگہ دوسرا پرزہ کام نہ دے سکے چاہے وہ پہلے سے کتنا ہی سڈول' نیا اور خوشنما کیوں نہ ہو۔ جانے ہوئے رستے سے ہم بے خوف' آنکھیں بند کئے چلے جاتے ہیں' اس کے نشیب و فراز' موڑ اور گھماؤ اب ہماری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس کسی انجان رستے پر چلنا کتنی زحمت کا باعث ہو سکتا ہے۔ قدم قدم پر گمراہ ہو جانے کے اندیشے' ہر لمحہ چور اور

رہزن کا خوف' بلکہ شاید آج میں ان کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل کرنے پر بھی تیار نہیں۔

راہ نجات

سپاہی کو اپنی لال پگڑی پر' عورت کو اپنے گہنوں پر' اور طبیب کو اپنے پاس بیٹھے ہوئے مریضوں پر جو ناز ہوتا ہے وہی کسان کو اپنے لہلہاتے ہوئے کھیت دیکھ کر ہوتا ہے۔ جھینگر اپنے ایکھ کے کھیتوں کو دیکھتا تو اس پر نشہ سا چھا جاتا ہے۔ تین بیگھے زمین تھی۔ اس کے چھ سو تو آپ ہی مل جائیں گے' اور جو کہیں بھگوان نے دنڈی تیز کر دی۔ (مراد نرخ سے) تو پھر کیا پوچھنا' دونوں بیل بوڑھے ہو گئے۔ اب کی نئی گوئیں بیسر کے میلہ سے لے آوے گا۔ کہیں دو بیگھے کھیت اور مل گئے تو لکھا لے گا۔ روپیوں کی کیا فکر ہے' بنئے ابھی سے خوشامد کرنے لگے تھے۔ ایسا کوئی نہ تھا جس سے اس نے گاؤں میں لڑائی نہ کی ہو۔ وہ اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔

ایک روز شام کے وقت وہ اپنے بیٹے کو گود میں لیے مٹر کی پھلیاں توڑ رہا تھا۔ اتنے میں اس کو بھیڑوں کا ایک جھنڈ اپنی طرف آتا دکھائی دیا' وہ اپنے دل میں کہنے لگا'

ادھر سے بھیڑوں کے نکلنے کا راستہ نہ تھا کیا کھیت کی مینڈ پر سے بھیڑوں کا جھنڈ نہیں جا سکتا تھا؟ بھیڑوں کو ادھر سے لانے کی کیا ضرورت؟ یہ کھیت کو کچلیں گی؟ چرین گی؟ اس کا دام کون دے گا۔ معلوم ہوتا ہے بدھو گڈریا ہے۔ بچہ کو گھمنڈ ہو گیا ہے جبھی تو کھیتوں کے بیچ میں سے بھیڑیں لیے جا رہا ہے۔ ذرا اس کی ڈھٹائی تو دیکھو۔ دیکھ رہا ہے کہ میں کھڑا ہوں اور پھر بھی بیڑوں کو لوٹاتا نہیں۔ کون میرے ساتھ کبھی سلوک کیا ہے کہ میں اس کی مرمت کروں۔ ابھی ایک بھیڑا مول مانگوں تو پانچ ہی روپے سناوے گا۔ ساری دنیا میں چار روپے کے کمبل بلتے ہیں پر یہ پانچ روپے سے کم بات نہیں کرتا۔

اتنے میں بھیڑیں کھیت کے پاس آگئیں۔ جھینگر نے للکار کر کہا ارے یہ بھیڑیں کہاں لیے آتے ہو کچھ سوجھتا ہے کہ نہیں؟

بدھو انکسار سے بولا۔ متو۔ ڈانڈ پر سے نکل جائیں گی' گھوم کر جاؤں گا' تو کوس بھر کا چکر پڑے گا۔ جھینگر۔ تو تمھارہ چکر بچانے کے لیے میں اپنا کھیت کیوں کچلاؤں ڈانڈ ہی پر سے لے جانا ہے تو اور کھیتوں کے ڈانڈے سے کیوں نہیں لے گئے؟ کیا مجھے کوئی چمار بھنگی سمجھ لیا ہے یا روپیہ کا گھمنڈ ہو گیا ہے؟ لوٹاؤ ان کو - بدھو۔ متو آج نکل جانے دو۔ پھر کبھی ادھر سے آؤں تو جو ڈنڈ (سزا) چاہے دینا۔

جھینگر کہہ دیا کہ لوٹاؤ انھیں۔ اگر ایک بھیڑ بھی مینڈ پر چڑھ آئی تمھاری کسل نہیں بدھو۔ متو' اگر تمھاری ایک بیل بھی کسی بھیڑ کے پیروں کے پنج آجائے تو مجھے بیٹھا کر سو گالیاں دینا۔

بدھو باتیں تو بڑی لجاجت سے کر رہا تھا۔ مگر لوٹنے میں اپنی کسر شان سمجھتا تھا اس نے دل میں سوچا کہ اسی طرح ذرا ذرا اسی دھمکیوں پر بھیڑوں کو لوٹانے لگا تو پھر میں بھیڑیں چرا چکا' آج لوٹ جاؤں گا تو کل کو کہیں نکلنے کا راستہ ہی نہ ملے گا سبھی رعب جمانے لگیں گے۔

بدھو بھی گھر کا مضبوط آدمی تھا۔ بارہ کوڑی بھیڑیں تھیں۔ انھیں کھیتوں میں

بٹھانے کے لیے فی شب ۱۸ کوڑی مزدوری ملتی تھی۔ اس کے علاوہ دودھ بھی فروخت کرتا تھا۔ اون کے کمبل بناتا تھا۔ سوچنے لگا یہ اتنے گرم ہو رہے ہیں' میرا کر ہی کیا لیں گے؟ کچھ ان کا بیل توہوں نہیں بھیڑوں نے جوہری ہری پتیاں دیکھیں تو بے کل ہو گئیں کھیت میں گھس پڑیں۔ بدھو انھیں دنڈوں سے مار مار کر کھیت کے کنارے سے ہٹاتا تھا۔ اور وہ ادھر ادھر سے نکل کر کھیت میں جا گھستی تھیں۔ ہینگڑ نے گرم ہو کر کہا۔ تم مجھے ہینگڑی جتانے چلے ہو تو تمھاری ہینگڑی بھلا دوں گا۔

بدھو۔ تمھیں دیکھ کر بھڑکتی ہیں' تم ہٹ جاؤ تو میں سب نکال لے جاؤں۔

جھینگر نے لڑکے کو گودی سے اتار دیا اور اپنا ڈنڈا سنبھال کر بھیڑوں کے سر ہو گیا۔ دھوبی بھی اتنی بے دردی سے اپنے گدھوں کو نہ مارتا ہو گا کسی بھیڑ کی ٹانگ ٹوٹی کسی کی کمر ٹوٹی۔ سب نے زور سے ممیانا شروع کیا۔ بدھو خاموش کھڑا ہوا اپنی فوج کی تباہی' اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا وہ نہ بھیڑوں کو ہانکتا تھا' اور نہ جھینگر سے کچھ کہتا تھا۔ بس کھڑا ہوا تماشا دیکھتا رہا۔ دو منٹ میں جھینگر نے اس فوج کو اپنی حیوانی طاقت سے مار بھگایا۔ بھیڑوں کی فوج کو تباہ کر کے فاتحانہ غرور سے بولا۔ اب سیدھے چلے جاؤ' پھر ادھر سے آنے کا نام نہ لینا۔

بدھو نے چوٹ کھائی ہوئی بھیڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جھینگر' تم نے یہ اچھا کام نہیں کیا۔ پچھتاؤ گے۔

کیلے کا کانٹا بھی اتنا آسان نہیں' جتنا کسان سے بدلا لینا۔ ان کی ساری کمائی کھیتوں میں رہتی ہے یا کھلیانوں میں کتنی ارضی و سماوی آفات کے بعد اناج گھر میں آتا ہے اور جو کہیں آفات کے ساتھ عداوت نے میل کر لیا تو بے چارہ کسان کہیں کا نہیں رہتا جھینگر نے گھر آ کر اور لوگوں سے اس لڑائی کا حال کہا تو لوگ سمجھانے لگے۔ "جھینگر" تم نے بڑا برا کیا۔ جان کر انجان بنتے ہو۔ بدھو کو جانتے نہں کہ کتنا جھگڑالو آدمی ہے ابھی کچھ نہیں بگڑا' جا کر اسے منا لو نہیں تو تمھارے ساتھ گاؤں پر

آفت آ جائے گی جھینگر کے سمجھ میں بات آئی' پچھتانے لگا کہ میں نے کہاں سے کہاں اسے روکا۔ اگر بھیڑیں تھوڑا بہت چر ہی جاتیں تو کون میں اجڑا جاتا تھا۔ اصل میں ہم کسانوں کا بھلا دب کر رہنے ہی میں ہے۔' بھگوان کو بھی ہمارا سر اٹھا کر چلنا اچھا نہیں لگتا "جی تو بدھو کے یہاں جانے کو نہ چاہتا تھا' مگر دوسروں کے اصرار سے مجبور ہو کر چلا۔ اگہن کا مہینہ تھا۔ کہرا پڑ رہا تھا۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ گاؤں سے باہر نکلا ہی تھا کہ یکا یک اپنے ایکھ کے کھیت کی طرف آگ کے شعلے دیکھ کر چونک پڑا دل دھڑکنے لگا۔ کھیت میں آگ لگی ہوئی تھی بے تحاشا دوڑا۔ مناتا جاتا تھا کہ میرے کھیت میں نہ ہو۔ مگر جیوں جیوں قریب پہنچتا تھا یہ پر امید وہم دور ہوتا جاتا تھا۔ وہ غضب ہی ہو گیا جسے روکنے کے لیے وہ گھر سے چلا تھا۔ ہتھیارے نے آگ لگا دی اور میرے پیچھے سارے گاؤں کو چوپٹ کر دیا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کھیت آج بہت قریب آگیا ہے گویا درمیان کے پرتی کھیتوں کو وجود ہی نہیں رہا۔ آخر جب وہ کھیت پر پہنچا تو آگ خوب بھڑک چکی تھی۔ جھینگر نے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔ گاؤں کے لوگ دوڑ پڑے اور کھیتوں سے ارہر کے پودے اکھاڑ کر آگ کو پیٹنے لگے۔ انسان و آتش کی باہمی جنگ کا منظر پیش ہو گیا۔ ایک پہر تک کہرام برپا رہا۔ کبھی ایک فریق غالب آتا' کبھی دوسرا۔ آتشی جانباز مرکر جی اٹھتے تھے اور دوگنی طاقت سے لڑائی میں مستعد ہو کر ہتھیار چلانے لگتے تھے۔ انسانی فوج میں جس سپاہی کی مستعدی سب سے زیادہ روشن تھی وہ بدھو تھا۔ بدھو کمر تک دھوتی چڑھائے اور جان کو ہتھیلی پر رکھے آگ کے شعلوں میں کود پڑتا تھا' اور دشمنوں کو شکست دیتے ہوئے بال بال بچ کر نکل آتا تھا۔ انسانی فوج فتحیاب ہوئی مگر ایسی فتح جس پر شکست بھی خندہ زن تھی گاؤں بھر کی ایکھ جل کر راکھ ہو گئی اور ایکھ کے ساتھ ساری تمنائیں بھی جل بھن گئیں۔

آگ کس نے لگائی' یہ کھلا ہوا راز تھا' مگر کسی کو کہنے کی ہمت نہ تھی کوئی ثبوت نہیں اور بلا ثبوت کے بحث کی وقعت ہی کیا؟ جھینگر کو گھر سے نکلنا محال ہو گیا۔ جدھر

جاتا طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہوتی۔ لوگ اعلانیہ کہتے کہ یہ آگ تم نے لگوائی تمھیں نے ہمارا ستیا ناس کیا۔ تمھیں مارے گھمنڈ کے دھرتی پر پاؤں نہ رکھتی تھے' آپ کے آپ گئے اور اپنے ساتھ گاؤں بھر کو بھی لے ڈوبی بدھو کو نہ چھیڑتے تو آج کیوں یہ دن دیکھنا پڑتا؟ جھینگر کو اپنی بربادی کا اتنا رنج نہ تھا۔ جتنا ان جلی کٹی باتوں کا۔ تمام دن گھر میں بیٹھا رہتا۔ پوس کا مہینہ آیا۔ جہاں ساری رات کولھو چلا کرتے تھے وہاں سناٹا تھا۔ جاڑوں کے سبب لوگ شام ہی سے کواڑ بند کر کے پڑ رہتے اور جھینگر کو کوستے تھے۔ راکھ اور بھی تکلیف دہ تھا۔ ایکھ صرف دولت دینے والی نہیں بلکہ کسانوں کے لیے زندگ بخش بھی ہے اسی کے سہارے کسانوں کا جاڑا پار ہوتا ہے۔ گرم رس پیتے ہیں' ایکھ کی پتیاں جلاتے ہیں اور اس کے اگوڑے جانوروں کو کھلاتے ہیں+۔ گاؤں کے سارے کتے جو رات کو بھٹیوں کی راکھ میں سویا کرتے تھے' سردی سے مر گئے۔ کتنے ہی جانور چارے کی قلت سے ختم ہو گئے۔ سردی کی زیادتی ہوئی اور کل گاؤں کھانسی بخار میں مبتلا ہو گیا اور یہ ساری مصیبت جھینگر کی کرنی تھی۔ ابھاگے ہتھیارے جھینگر کی۔

جھینگر نے سوچتے سوچتے قصد کر لیا کہ بدھو کی حالت بھی اپنی ہی سی بناؤں گا اس کے کارن میرا ستیا ناس ہو گیا' اور وہ چین کی بانسری بجا رہا ہے۔ میں بھی اس کا ستیا ناس کر دوں گا۔

جس روز اس مسلک عناد کی ابتدا ہوئی اس روز سے بدھو نے اس طرف آنا ترک کر دیا تھا۔ جھینگر نے اس سے ربط ضبط بڑھانا شروع کیا۔ وہ بدھو کو دکھلانا چاہتا تھا کہ تم پر مجھے ذرا بھی شک نہیں ہے۔ ایک روز کمبل لینے کے بہانے گیا' پھر دودھ لینے کے بہانے جانے لگا۔ بدھو اس کی خوب آؤ بھگت کرتا۔ چلم تو آدمی دشمن کو بھی پلا دیتا ہے' وہ اسے بلا دودھ اور شربت پلائے نہ جانے دیتا۔ جھینگر آج کل ایک سن لپیٹنے والی مشین میں مزدوری کرنے جایا کرتا تھا۔ اکثر کئی روز کی اجرت یکجائی ملتی تھی۔ بدھو ہی کی مدد سے جھینگر کا روزانہ خرچ چلتا تھا۔ بس جھینگر نے خوب میل جول پیدا

کر لیا۔ ایک روز بدھو نے پوچھا۔ کیوں جھینگر' اگر اپنی ایکھ جلانے والے کو پا جاؤ تو کیا کرو؟ سچ کہنا۔

جھینگر نے متانت سے کہا۔ میں اس سے کہوں کہ بھیا' تم نے جو کچھ کیا بہت اچھا کیا میرا گھمنڈ تو توڑ دیا مجھے آدمی بنا دیا۔

بدھو میں تمھاری جگہ ہوتا تو اس کا گھر جلائے بغیر نہ ماننا۔

جھینگر۔ چار دن کی جندگانی میں بیر بڑھانے سے کون فائدہ؟ میں تو بربادی ہوا' اب اسے برباد کر کے کیا پاؤں گا۔؟

بدھو بس یہی تو آدمی کا دھرم ہے۔ مگر بھائی کرودھ (غصہ) کے بس میں ہو کر بدھی الٹی ہو جاتی ہے۔

پھاگن کا مہینہ تھا۔ کسان ایکھ بونے کے لیے کھیتوں کو تیار کر رہے تھے' بدھو کا بازار گرم تھا۔' بھیڑوں کی لوٹ مچی ہوئی تھی۔ دو چار آدمی روزانہ دروازہ پر کھڑے خوشامد کیا کرتے۔ بدھو کسی سے سیدھے منھ بات نہ کرتا بھیڑ بٹھانے کی اجرت دوگنی کر دی تھی۔ اگر کوئی اعتراض کرتا تو بے لاگ کہتا۔ "بھیا' بھیڑیں تمھارے گلے تو نہیں لگاتا ہوں۔ جی نہ چاہے تو نہ بٹھلاؤ لیکن میں نے جو کہہ دیا ہے اس سے ایک کوڑی بھی کم نہیں ہو سکتی۔" غرض تھی لوگ اس کی بے مروتی پر بھی اسے گھیرے ہی رہتے تھے' جیسے پنڈے کسی جاتری کے پیچھے پڑے ہوں۔"

لکشمی کا جسم تو بہت بڑا نہیں اور وہ بھی وقت کے مطابق چھوٹا بڑا ہوتا رہتا ہے۔ حتی کہ کبھی وہ اپنی قدو قامت کو سمیٹ کر چند کاغذی الفاظ ہی میں چھپا لیتی ہے' کبھی کبھی تو انسان کی زبان پر جا بیٹھتی ہے' جسم غائب ہو جاتا ہے۔ مگر ان کے رہنے کے لیے وسیع جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ آئیں اور گھر بڑھنے لگا چھوٹے چھوٹے مکان میں ان سے نہیں رہا جاتا۔ بدھو کا گھر بھی بڑھنے لگا۔ دروازہ پر برآمدے کی تعمیر ہوئی' دو کی جگہ چھ کوٹھریاں بنوائی گئیں۔ یوں کہیے کہ مکان از سر نو بننے لگا کسی کسان سے

لکڑی مانگی ' کسی سے کھپریل کا آنوا لگانے کے لیے اپلے' کسی سے بانس اور کسی سے سرکنڈے۔ دیوار بنانے کی اجرت دینی پڑی۔ وہ بھی نقد نہیں' بھیڑ کے بچوں کی شکل میں لکشمی کا یہ اقبال ہے' سارا کام بیگار میں ہو گیا مفت میں اچھا خاصا مکان تیار ہو گیا داخلہ کے جشن کی تیاریاں ہونے لگیں۔

ادھر جھینگر دن بھر مزدوری کرتا تو کہیں آدھ پیٹ اناج ملتا۔ بدھو کے گھر میں کنچن برس رہا تھا۔ جھینگر جلتا تھا تو کیا برا کرتا تھا؟ یہ انیائے کس سے سہا جائے گا۔

ایک روز وہ ٹہلتا ہوا چماروں کے ٹولے کی طرف چلا گیا۔ ہری ہر کو پکارا ہری ہر نے آکر رام رام کی اور چلم بھری' دونوں پینے لگے۔ یہ چماروں کا کھیا بڑا بدمعاش آدمی تھا۔ سب کسان اس سے تھر تھر کانپتے تھے۔

جھینگر نے چلم پیتے پیتے کہا۔ آج کل بھاگ داگ نہیں ہوتا کیا؟ کہو' تمھاری آج کل کیسی کٹتی ہے؟

جھینگر۔ کیا کٹتی ہے۔ نکٹا جیا برے حال؟ دن بھر کارخانے میں مجوری کرتے ہیں تو چولھا جلتا ہے۔ چاندی تو آج کل بدھو کی ہے۔ رکھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ نیا گھر بنا۔ بھیڑیں اور لی ہیں۔ اب گرہ پردیش (داخلہ مکان) کی دھوم ہے۔ ساتوں گاؤں میں نیوتنے کی سپاری جائے گی۔

ہری ہر بچھی میا آتی ہیں تو آدمی کی آنکھوں میں سیل (مروت) آجاتی ہے۔ مگر اس کو دیکھو دھرتی پر پاؤں نہیں دھرتا۔ بولتا ہے تو اینٹھ کر بولتا ہے۔

جھینگر کیوں نہ اینٹھے؟ اس گاؤں میں کون ہے اس کے ٹکر کا؟ پریار یہ انیائے تو نہیں دیکھا جاتا۔ جب بھگوان دیں تو سر جھکا کر چلنا چاہیں یہ نہیں کہ اپنے برابر کسی کو سمجھے ہی نہیں۔ اس کی مویشی سنتا ہوں تو بدن میں آگ لگ جاتی ہے' کل کا بانی آج کا سیٹھ۔ چلا ہے ہمیں سے اکڑنے ابھی کل لنگوٹی لگائے کھیتوں میں کوے ہانکا کرتا تھا' آج اس کا آسمان میں دیا جلتا ہے۔

ہری ہر۔ کہو تو کچھ جوگ جاگ کروں۔

جھینگر۔ کیا کرو گے؟ اسی ڈر سے تو وہ گائے بھینس نہیں پالتا۔

ہری ہر۔ بھیڑیں تو ہیں۔

جھینگر۔ کیا بگلا مارے پکھنا ہاتھ۔

ہری ہر۔ پھر تمھیں سوچو۔

جھینگر۔ ایسی جگت نکالو کہ پھر پنپنے نہ پائے۔

اس کے بعد دونوں میں کانا پھوسی ہونے لگی۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ نیکی میں جتنی نفرت ہوتی ہے' بدی میں اتنی ہی رغبت۔ عالم عالم کو دیکھ کر' سادھو سادھو و دیکھ کر' شاعر شارر کو دیکھ کر جلتا ہے۔ ایک دوسرے کی صورت صنیں دیکھنا چاہتا مگر جواری جواری کو دیکھ کر' شرابی شرابی کو دیکھ کر' چور چور کر دیکھ کر' ہمدردی جتاتا ہے' مدد کرتا ہے۔ ایک پنڈت جی اگر اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑیں تو دوسرے پنڈت جی انھیں اٹھانے کے بجائے دو ٹھوکریں اور لگائے کہ وہ پھر اٹھ ہی نہ سکیں' مگر ایک چور پر آفت آتے دیکھ کر دوسرا چور اس کی آڑ کر لیتا ہے۔ بدی سے سب نفرت کرتے ہیں اس لیے بدوں میں باہمی محبت ہوتی ہے۔ نیکی کی ساری دنیا تعریف کرتی ہے' اس لیے نیکوں میں مخالفت ہوتی ہے۔ چور کو مار کر چور کیا پائے گا؟ نفرت عالم کی توہین کر کے عالم کیا پائے گا۔؟ نیک نامی۔

جھینگر اور ہری ہر نے صلاح کر لی۔ سازش کی تدبیر سوچی گئی اس کا نقشہ وقت اور طریقہ طے کیا گیا۔ جھینگر چلا تو اکڑا جاتا تھا۔ مار لیا دشمن کو۔ اب کہاں جاتا ہے۔

دوسرے روز جھینگر کام پر جانے لگا تو پہلے بدھو کے گھر پہنچا۔ بدھو نے پوچھا کیوں آج نہیں گئے کیا؟ جھینگر۔ جا تو رہا ہوں' تم سے یہی کہنے آیا تھا کہ میری بچھیا کو اپنی بھیڑوں کے ساتھ کیوں نہیں چرا دیا کرتے؟ بے چاری کھونٹے پر بندھی مری جاتی ہے۔ "نہ گھاس' نہ چارا' کیا کھلا دیں"؟

بدھو؟ بھیا میں گائے بھینس نہیں رکھتا۔ چماروں کو جانتے ہو یہ ایک ہی

ہتھیارے ہوتے ہیں۔ اسی ہری ہر نے میری دو گائیں مار ڈالیں' نہ جانے کیا کھلا دیتا ہے۔ تب سے کان پکڑے کہ اب گائے بھینس نہ پالوں گا۔ لیکن تمہاری ایک ہی بچھیا ہے۔ اس کا کوئی کیا کرے گا؟ جب چاہو پہنچا دو۔

یہ کہہ کر بدھو اپنے مکان والی دعوت کا سامان اسے دکھانے لگا۔ گھی' شکر' میدہ ترکاری سب منگا کر رکھا تھا۔ صرف ست نرائن کی کتھا کی دیر تھی جھینگر کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایسی تیاری نہ اس نے خود کبھی کی تھی اور نہ کسی کو کرتے دیکھی تھی۔ مزدوری کر گھر کو لوٹا تو سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ اپنی بچھیا کو بدھو کے گھر پہنچانا تھا۔ اسی رات کو بدھو کے یہاں ست نرائن کی کتھا ہوئی "دبرمہ بھوج" بھی کیا گیا' ساری رات برہمنوں کی تواضع و تکریم میں گزری بھیڑوں کے کلہ میں جانے کا موقع ہی نہ ملا۔ علی الصباح کھانا کھا کر اٹھا ہی تھا (کیوں کہ رات کا کھانا صبح ملا) کہ ایک آدمی نے آکر خبر دی۔ بدھو تم یہاں بیٹھے ہو۔ ادھر بھیڑوں میں بچھیا مری پڑی ہے۔ بھلے آدمی' اس کی پگھیا بھی نہیں کھولی تھی۔

بدھو نے سنا اور گویا ٹھوکر لگ گئی۔ جھینگر بھی کھانا کھا کر وہیں بیٹھا تھا۔ بولا ہائے میری بچھیا۔ چلو ذرا دیکھوں تو' میں نے تو پگھیا نہیں لگائی تھی۔ اسے بھیڑوں میں پہنچا کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ تم نے یہ پگھیا کب لگا دی۔

بدھو۔ بھگوان جانے جو میں نے اس کی پگھیا دیکھی بھی ہو' میں تو تب سے بھیڑوں میں گیا ہی نہیں۔

جھینگر۔ جاتے نہ تو پگھیا کون لگا دیتا؟ گئے ہو گے' یاد نہ آتی ہو گی۔

ایک برہمن۔ مری تو بھیڑوں ہی میں نا؟ دنیا تو یہی کہے گی کی بدھو کی غفلت سے اس کی موت ہوئی چاہے پگھیا کسی کی ہو۔

ہری ہر۔ میں نے کل سانجھ کو انھیں بھیڑوں میں بچھیا کو باندھتے دیکھا تھا۔

بدھو۔ مجھے؟

ہری ہر۔ تم نہیں لاٹھی کندھے پر رکھے' بچھیا کو باندھ رہے تھے؟

بدھو۔ بڑا سچا ہے تو' تو نے مجھے بچھیا کو باندھتے دیکھا تھا؟

ہری ہر۔ تو مجھ پر کاہے کو بگڑتے ہو بھائی؟ تم نے نہیں باندھی تو نہیں سہی۔

برہمن۔ اس کا نشچے کرنا ہوگا گو ہتھیا کو پراشچت کرنا پڑے گا' کچھ ہنسی ٹھٹھا ہے۔

جھینگر۔ مہاراج' کچھ جان بوجھ کر تو باندھی نہیں۔

برہمن۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ ہتھیا اسی طرح لگتی ہے کوئی گئو کو مارنے نہیں جاتا۔

جھینگر۔ ہاں۔ گئوؤں کو کھولنا باندھنا ہے تو جوکھم کا کام۔

برہمن۔ شاستروں میں اسے مہاپاپ کہا ہے۔ گئو کی ہتھیا برہمن کی ہتھیا سے کم نہیں۔

جھینگر۔ ہاں' پھر گئو تو ٹھہری ہی اسی سے نہ ان کا مان (اور) ہے۔ جو ماتا سو گئو۔ لیکن مہاراج۔ چوک ہو گئی۔ کچھ ایسا کیجئے کہ بے چارہ تھوڑے میں نپٹ جائے۔

بدھو کھڑا سن رہا تھا کہ خواہ مخواہ میرے سر گئو ہتھیا کا الزام تھوپا جا رہا ہے۔ جھینگر کی چالاکی بھی سمجھ رہا تھا' میں لاکھ کہوں کہ میں نے بچھیا نہیں باندھی پر مانے گا کون؟ لوگ یہی کہیں گے کہ پراشچت سے بچنے کے لئے ایسا کہہ رہا ہے۔

برہمن دیوتا کا بھی اس کے پراشچت کرانے میں فائدہ تھا۔ بھلا ایسے موقع پر کب چوکنے والے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بدھو کو ہتھیا لگ گئی۔ برہمن بھی اس سے جل رہے تھے۔ کسر نکالنے کا موقع ملا۔ تین ماہ تک بھیک مانگنے کی سزا دی گئی۔ پھر سات تیرتھوں کی جاترا' اس پر پانچ سو برہمنوں کا کھلانا اور پانچ گایوں کا دان۔ بدھو نے سنا تو ہوش اڑ گئے۔ رونے پیٹنے لگا' تو سزا گھٹا کر دو ماہ کر دی گئی۔ اس کے سوا کوئی رعایت نہ ہو سکی۔ نہ کہیں اپیل' نہ کہیں فریاد۔ بے چارے کو یہ سزا قبول کرنی پڑی۔

بدھو نے بھیڑیں۔ ایشور کو سونپیں۔ لڑکے چھوٹے تھے۔ عورت اکیلی کیا کرتی۔ غریب جا کر دروازوں پر کھڑا ہوتا اور منہ چھپاتے ہوئے کہتا گائے کی باچھی دیو بن باس۔ بھیک تو مل جاتی مگر بھیک کے ساتھ دو چار سخت اور توہین آمیز فقرے بھی سننے

پڑتے۔ دن کو جو کچھ پاتا اسی کو شام کے وقت کسی درخت کے نیچے پکا کر کھا لیتا اور وہیں پر رہتا۔ تکلیف کی تو اس کو پرواہ نہ تھی' بھیڑوں کے ساتھ تمام دن چلتا ہی تھا' درخت کے نیچے سوتا ہی تھا' کھانا بھی اس سے کچھ بہتر ہی ملتا تھا' مگر شرم تھی بھیک مانگنے کی۔ خصوصاً" جب کوئی بدمزاج عورت یہ طعنے دیتی کہ روٹی کمانے کا اچھا ڈھنگ نکالا ہے' تو اسے دلی قلق ہوتا تھا۔ مگر کرے کیا۔

دو ماہ بعد وہ گھر واپس آیا۔ بال بڑھے ہوئے تھے' کمزور اس قدر کہ گویا ساٹھ سال کا بوڑھا ہو۔ تیرتھ جانے کے لئے روپیوں کا بندوبست کرنا تھا۔ گڑریوں کو کون مہاجن قرض دے۔ بھیڑوں کا بھروسہ کیا؟ کبھی کبھی وبا پھیلتی ہے تو رات بھر میں گلہ کا گلہ صاف ہو جاتا ہے۔ اس پر جیٹھ کا مہینہ جب بھیڑوں سے کوئی آمدنی ہونے کی امید نہیں' ایک تیلی راضی بھی ہوا تو ۲ ر فی روپیہ سود پر۔ آٹھ ماہ میں سود اصل کے برابر ہو جائے گا۔ یہاں قرض لینے کی ہمت نہ پڑی۔ ادھر دو مہینوں میں کتنی ہی بھیڑیں چوری چلی گئیں۔ لڑکے چرانے لے جاتے تھے۔ دوسرے گاؤں والے چپکے سے دو ایک بھیڑیں کسی کھیت یا گھر میں چھپا دیتے اور بعد کو مار کر کھا جاتے' لڑکے بے چارے ایک تو نہ پکڑ سکتے اور جو کچھ پکڑ بھی لیتے تو لڑیں کیسے؟ سارا گاؤں ایک ہو جاتا تھا۔ ایک ماہ میں بھیڑیں آدھی بھی نہ رہ جائیں گی۔ بڑا مشکل مسئلہ تھا۔ مجبوراً" بدھو نے ایک قصاب کو بلایا اور سب بھیڑیں اس کے ہاتھ فروخت کر ڈالیں' پانچ سو روپے ہے ان میں سے دو سو لے کر وہ تیرتھ یاترا کرنے گیا۔ بقیہ روپیہ برمہ بھوج کے لئے چھوڑ گیا۔

بدھو کے جانے پر اس کے مکان میں دو بار نقب ہوئی مگر یہ خیریت ہوئی کہ جاگ پڑنے کی وجہ سے روپے بچ گئے۔

ساون کا مہینہ تھا چاروں طرف ہریالی پھیلی ہوئی تھی۔ جھینگر کے بیل نہ تھے' کھیت بٹائی پر دے دئے تھے۔ بدھو پراشچت سے فارغ ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مایا کے پھندے سے بھی آزاد ہو گیا تھا۔ نہ جھینگر کے پاس کچھ تھا' نہ بدھو کے پاس۔

کون کس سے جلتا اور کس لئے جلتا؟

سن کی کل بند ہو جانے کے سبب جھینگر اب نیلداری کا کام کرتا تھا۔ شہر میں ایک بڑا دھرم شالہ بن رہا تھا۔ ہزاروں مزدور کام کرتے تھے۔ جھینگر بھی انہیں میں تھا' ساتویں روز مزدوری کے پیسے لے کر گھر آتا تھا اور رات بھر رہ کر سویرے پھر چلا جاتا تھا۔

بدھو بھی مزدوری کی تلاش میں یہیں پہنچا۔ جمعدار نے دیکھا کہ کمزور آدمی ہے' سخت کام تو اس سے ہو نہ سکے گا۔ کاری گروں کا گارا پہچانے کے لئے رکھ لیا' بدھو سر پر طاش رکھے گارا لینے گیا' تو جھینگر کو دیکھا۔ رام رام ہوئی۔ جھینگر نے گارا بھر دیا۔ بدھو نے اٹھا لیا۔ دن بھر دونوں اپنا کام کرتے ہیں۔

شام کو جھینگر نے پوچھا۔ کچھ بناؤ گے نا؟

بدھو۔ نہیں تو کھاؤں گا کیا؟

جھینگر۔ میں تو ایک جون جینا کر لیتا ہوں۔ اس جوں ستو کھاتا ہوں کون جھنجھٹ کرے؟

بدھو۔ ادھر ادھر لکڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ بٹور لاؤ۔ آٹا گھر سے لیتا آیا ہوں گھر ہی میں پسوا لیا تھا۔ یہاں تو بڑا مہنگا ملتا ہے۔ اسی پتھر والی چٹان پر آٹا گوندھے لیتا ہوں۔ تم تو میرا بنایا کھاؤ گے نہیں۔ اس لئے تمہیں روٹیاں سینکو میں روٹیاں بناتا جاؤں گا۔

جھینگر۔ توا بھی نہیں ہے۔

بدھو۔ توے بہت ہیں یہی گارے کا تسلہ مانجے لیتا ہوں۔

آگ جلی' آٹا گوندھا گیا جھینگر نے کچی پکی روٹیاں تیار کیں۔ بدھو پانی لایا۔ دونوں نے نمک مرچ کے ساتھ روٹیاں کھائیں۔ پھر چلم بھری گئی۔ دونوں پتھر کی سلوں پر لیٹے اور چلم پینے لگے۔

بدھو نے کہا۔ تمہاری اوکھ میں آگ میں نے لگائی تھی۔

جھینگر نے مذاق آمیز لہجہ میں کہا۔ جانتا ہوں۔

ذرا دیر بعد جھینگر بولا۔ بچھیا میں نے ہی باندھی تھی اور ہری ہر نے اسے کچھ کھلا دیا تھا۔

بدھو نے بھی اسی لہجہ میں کہا جانتا ہوں۔

پھر دونوں سو گئے۔

بڑے بھائی صاحب

میرے بھائی صاحب مجھ سے پانچ سال بڑے تھے لیکن صرف تین درجے آگے تھے۔ انہوں نے بھی اسی عمر پڑھنا شروع کیا تھا۔ جب میں نے شروع کیا تھا ..... لیکن تعلیم جیسے اہم معاملہ میں وہ جلد بازی سے کام لینا پسند نہ کرتے تھے۔ اس عمارت کی بنیاد خوب مضبوط ڈالنا چاہتے تھے۔ ایک سال کا کام دو سال میں کرتے تھے تاکہ عمارت پختہ ہو جائے۔

میں چھوٹا تھا وہ بڑے تھے' میری عمر نو سال تھی' وہ چودہ سال کے تھے انہیں میری تنبیہہ اور نگرانی کا پورا پیدائشی حق تھا اور میری سعادت مندی اس میں تھی کہ ان کے حکم کو قانون سمجھوں۔

وہ بڑے محنتی واقع ہوئے تھے۔ ہر وقت کتاب کھولے بیٹھے رہتے تھے اور شاید

دماغ کو آرام دینے کے لئے کبھی کتاب پر کبھی کتاب کے حاشیوں پر چڑیوں' کتوں' بلیوں کی تصویریں بنایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی' ایک شعر کو دس بیس بار خوش خط حروف میں نقل کرتے کبھی ایسی عبارتیں لکھتے جن میں کوئی ربط نہ ہوتا نہ کوئی معنی۔ مثلاً" ایک بار ان کی کاپی میں میں نے یہ عبارت دیکھی' اسپیشل' آئینہ' بھائیو' بھائیوں دراص بھائی بہن رادھے شیام' شری جت رادھے شیام ایک گھنٹے تک' اس کے بعد ایک انسان کا چہرہ تھا۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ اس عبارت سے کوئی معنی نکالوں لیکن ناکام رہا اور ان سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ نویں جماعت میں تھے' میں چھٹی جماعت میں تھا۔ ان کی تحریر میرے لئے چھوٹا منہ بڑی بات تھی۔

میرا جی پڑھنے میں بالکل نہ لگتا۔ ایک گھنٹہ بھی کتاب لے کر بیٹھنا بار خاطر تھا۔ موقع پاتے ہی ہوسٹل سے نکل کر میدان میں آ جاتا اور کبھی کنکریاں اچھالتا' کبھی کاغذ کی تیلیاں اڑاتا اور کہیں کوئی ساتھی مل گیا تو پوچھنا ہی کیا؟ کبھی چہار دیواری پر چڑھ کر پیچھے کود رہے ہیں۔ کبھی پھاٹک پر سوار ہو کر موٹر کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ لیکن کمرہ میں آتے ہی بھائی صاحب کی صورت دیکھ کر روح فنا ہو جاتی اور سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ پہلا سوال ہوتا کہاں تھے؟ اس کا جواب خاموشی کے سوا میرے پاس کچھ نہ ہوتا۔ نہ جانے میری زبان سے یہ بات کیوں نہ نکلتی کہ ذرا باہر کھیل رہا تھا۔ میری خاموشی اعتراف گناہ سمجھ جاتی اور بھائی صاحب بزرگانہ محبت اور تندی سے ملے جلے لہجے میں کہتے "اس طرح انگریزی پڑھو گے تو زندگی بھر پڑھتے رہو گے اور ایک حرف نہ آئے گا۔ انگریزی پڑھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے جو چاہے پڑھ لے۔ اس طرح انگریزی آتی تو سبھی پڑھ لیتے' یہاں رات دن آنکھیں پھوڑنی پڑتی ہیں' خون جلانا پڑتا ہے تب جا کے کہیں انگریزی آتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ تم اتنے کوڑھ مغز ہو کہ مجھے دیکھ کر بھی سبق نہیں لیتے' میں کتنی محنت کرتا ہوں' یہ تم اپنی آنکھوں میں دیکھتے ہو' اگر نہیں دیکھتے تو یہ تمہارا قصور ہے' تمہاری عقل کا قصور ہے' اتنے میلے تماشے ہوتے ہیں میں کبھی نہیں جاتا۔ کرکٹ اور ہاکی کے میچ ہوتے ہیں' میں قریب تک نہیں

پھٹکتا۔ ہمیشہ پڑھتا ہوں' اس پر بھی دو دو تین تین سال تک ایک ایک درجہ میں پڑا رہتا ہوں' پھر تم کیسے امید کرتے ہو کہ تم یوں کھیل کود میں وقت گنوا کر پاس ہو جاؤ گے۔ مجھے دو ہی تین سال لگتے ہیں تم ساری زندگی اسی درجے میں پڑے رہو گے مگر تمہیں اس طرح عمر گنوانی ہے تو بہتر ہے گھر چلے جاؤ اور مزے سے گلی ڈنڈا کھیلو۔ دادا کی گاڑھے پسینے کی کمائی کے روپے کیوں برباد کرتے ہو۔

میں یہ پھٹکار سن کر آنسو بہانے لگتا۔ جواب ہی کیا تھا' بھائی صاحب کو نصیحت کے فن میں کمال تھا ایسی ایسی لگتی باتیں کہتے تھے کہ میرے جگر کے ٹکڑے ہو جاتے اور ہمت ٹوٹ جاتی۔ اس طرح جان توڑ کر محنت کرنے کی طاقت میں اپنے میں نہ پاتا اور ذرا دیر کے لئے مجھ پر مایوسی آ جاتی اور میں سوچتا کیوں نہ گھر چلا جاؤں جو کام میرے ہونے کے باہر ہے اس میں ہاتھ ڈال کر کیوں اپنی زندگی خراب کروں۔ اس کے ساتھ ہی آئندہ سے خوب جی لگا کر پڑھنے کا ارادہ کرتا۔ ٹائم ٹیبل بناتا صبح اٹھتا' منہ دھو کر ناشتہ کرتا۔ پھر انگریزی مطالعہ سات آٹھ بجے تک حساب آٹھ سے نو بجے تک تاریخ نو سے ساڑھے نو تک کھانا کھا کر اسکول جاتا ساڑھے تین بجے اسکول سے واپس آ کر آدھ گھنٹے تک آرام' پانچ تک جغرافیہ اور نقشہ' پانچ سے چھ تک گرائمر آدھ گھنٹہ آرام چھ سے ساڑھے آٹھ تک انگریزی کمپوزیشن پھر کھانا کھا کر آٹھ سے نو بجے تک انگریزی نو سے دس تک اردو' دس سے گیارہ تک متفرق مضامین۔

مگر ٹائم ٹیبل بنا لینا ایک بات تھی' اس پر عمل کرنا دوسری بات۔ پہلے ہی دن سے اس کی خلاف ورزی شروع ہو جاتی۔ میدان کی وہ فرحت انگیز ہوا' وہ دلاویز ہریالی وہ پرلطف آزادی مجھے اضطراری طور پر کھینچ لے جاتی اور بھائی صاحب کو نصیحت کرنے کا موقع مل جاتا۔ میں اس کے سایہ سے بھاگتا تھا۔ ان کی نگاہوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا کمرہ میں اس طرح دبے پاؤں آتا کہ انہیں خبر نہ ہو ان کی نظر میری جانب اٹھی اور میری روح فنا ہو جاتی۔ ہمیشہ سر پر ایک برہنہ شمشیر سی لٹکتی ہوئی معلوم ہوتی کتابوں سے نفرت سی ہوتی جاتی تھی۔

سالانہ امتحان ہوا' بھائی صاحب فیل ہو گئے' میں پاس ہو گیا اپنے درجہ میں اول آیا میرے اور ان کے درمیان صرف دو درجوں کا تفاوت ہو گیا۔ جی میں آیا بھائی صاحب کو آڑے ہاتھ لوں۔ آپ کی وہ شبانہ روز کی دیدہ ریزی کہاں گئی" وہ اس قدر پژمردہ شکستہ خاطر تھے کہ مجھے ان سے دلی ہمدردی ہوئی اور ان کے زخم پر نمک چھڑکنے کا خیال ہی شرمناک معلوم ہوا ہاں اب مجھے اپنے اوپر کچھ اعتماد پیدا ہوا اور بھائی ... صاحب کا وہ رعب مجھ پر نہ رہا۔ آزادی سے کھیل کود میں شریک ہونے لگا دل مضبوط تھا۔ اگر انہوں نے پھر نصیحت کی تو صاف کہہ دوں گا آپ نے اپنا خون جلا کر کونسا تیر مار لیا ہے۔ میں تو کھیلتے کودتے درجہ میں اول آگیا۔ زبان سے یہ بیکرمی جتانے کی ہمت نہ ہونے پر بھی میرے بشرے اور انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میں بھائی صاحب سے اتنا مرعوب نہیں ہوں۔ بھائی صاحب نے بھانپ لیا اور ایک روز جب میں صبح کا سارا وقت گلی ڈنڈے کی نذر کر کے ٹھیک کھانے کے وقت لوٹا تو بھائی صاحب نے گویا میان سے تلوار کھینچ لی اور مجھ پر ٹوٹ پڑے "دیکھتا ہوں امسال پاس ہو گئے اور درجہ اول میں تو اب تمہارے دماغ ہو گئے۔ مگر بھائی جان گھمنڈ تو بڑے بڑوں کا نہیں رہا۔ تمہاری کیا ہستی ہے۔" تاریخ میں راون کا حال تو پڑھا ہی ہو گا اس کی زندگی سے تم نے آخر کیا نتیجہ نکالا یوں ہی پڑھ گئے۔ محض امتحان پاس کر لینا تو کوئی بڑی چیز نہیں اصل چیز ہے تاریخ سے سبق حاصل کرنا' راون ساری دنیا مہاراجہ تھا ایسے راجوں کو چکرورتی کہتے ہیں۔ آج کل انگریزوں کا راج بہت وسیع ہے مگر انہیں چکرورتی راجہ نہیں کہہ سکتے۔ راون چکر ورتی راجہ تھا۔ بڑے بڑے دیوتا اس کی غلامی کرتے تھے' آگ اور پانی کے دیوتا بھی اس کے غلام تھے۔ مگر اس کا انجام کیا ہوا' غرور نے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا' کوئی اسے ایک چلو پانی دینے والا نہ بچا۔ انسان اور چاہے جو برائی کرے' غرور کیا اور دین و دنیا سے گیا۔ ابلیس کا حال بھی پڑھا ہو گا۔ اسے بھی غرور ہوا تھا۔ نتیجہ یہ کہ جنت سے دوزخ میں دھکیل دیا۔ شاہ روم

نے بھی ایک بار غرور کیا تھا بھیک مانگ مانگ کر مر گیا۔ تم نے ابھی صرف ایک درجہ پاس کیا ہے اور ابھی سے تمہارا سر پھر گیا' تب تو تم آگے پڑھ چکے' یہ سمجھ لو کہ تم اپنی محنت سے نہیں پاس ہوئے اندھے کے ہاتھ میں بٹیر لگ گئی مگر بٹیر صرف ایک بار ہاتھ لگ سکتی ہے بار بار نہیں لگ سکتی۔ کبھی کبھی گلی ڈنڈے میں بھی اندھے چوٹ نشانہ پڑ جاتا ہے' اس سے کوئی کامیاب کھلاڑی نہیں ہو جاتا۔ کامیاب کھلاڑی وہ ہے جس کا کوئی نشانہ خالی نہ جائے۔ میرے فیل ہونے پر مت جاؤ۔ میرے درجہ میں آؤ گے تو دانتوں پسینہ آ جائے گا۔ جب الجبرا اور جیومیٹری کے لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے اور انگلستان کی تاریخ پڑھنا پڑے گی بادشاہوں کے نام یاد رکھنا آسان سمجھتے ہو ہنری ساتویں کی جگہ آٹھویں لکھا اور سب نمبر غائب' صفر بھی نہ ملے گا۔ صفر بھی! کس خیال میں ہو' درجنوں تو جیمس ہوئے ہیں اور درجنوں ولیم کوڑیوں چارلس' دماغ چکر کھانے لگتا ہے ان کمبختوں کو نام بھی نہ جڑتے تھے ایک ہی نام کے پیچھے دوم' سوم' چہارم' پنجم لگاتے چلے گئے اور جیومیٹری تو بس خدا کی پناہ اب ج اور اج ب میں کیا فرق ہے اور کیوں اس مہمل بات کے لئے طالب علموں کا خون کرتے ہو؟ دال بھات روٹی اور دال روٹی بھات میں کونسا فرق ہے مگر ممتحنوں کو کیا پروا وہ تو وہی دیکھتے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے چاہتے ہیں سب لڑکے رٹو ہو جائیں۔ اس رٹنٹ کا نام تعلیم رکھ چھوڑا ہے اور آخر ایسی بے سر پیر کی باتیں پڑھانے سے فائدہ ہی کیا؟ اس خط پر وہ عمودا" گرا دو تو قاعدے عمود سے دوگنا ہو گا پوچھئے اس سے کیا مطلب؟ دوگنا نہیں چوگنا ہو جائے گا۔ آٹھ گنا ہو جائے میری بلا سے لیکن پڑھنا ہے تو یہ ساری باتیں یاد رکھنی پڑیں گی۔ انگریزی مضامین لکھنے پڑھتے ہیں' کہہ دیا "وقت کی پابندی" پر ایک مضمون لکھو جو چار صفحے سے کم نہ ہو اب کاپی کھولے ہوئے اس کے نام کو ـــــ کون نہیں جانتا وقت کی پابندی اچھی بات ہے لیکن اس پر چار صفحے کیسے لکھے؟ جو بات ایک جملہ میں کہی جا سکے اس کے لئے چار صفحے لکھنے کی کیا ضرورت' میں تو اسے حماقت کہتا ہوں مگر نہیں آپ کو چار صفحے لکھنے پڑیں گے چاہے جیسے لکھئے اور صفحے بھی

پورے فلسکیپ سائز کے یہ لڑکوں پر ستم ناروا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ ظالم اس پر بھی یہ کہے جاتے ہیں کہ اختصار سے بھی کام لو تیز بھی دوڑیئے اور آہستہ آہستہ بھی رہے متضاد ہے یا نہیں' بچہ بھی سمجھ سکتا ہے لیکن ان ماسٹروں کو اتنی بھی تمیز نہیں اس پر دعوی ہے کہ ہم ماسٹر ہیں' میرے درجے میں آؤ گے تو یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ اور درجہ میں اول آ گئے ہو تو اتنا اتراتے ہو میں لاکھ فیل ہو گیا' لیکن تم سے بڑا ہوں' دنیا کا تم سے زیادہ تجربہ حاصل کیا ہے میرا کہنا مانو جو کچھ کہتا ہوں اسے گرہ سے باندھو ورنہ پچھتاؤ گے۔

اسکول کا وقت قریب تھا' ورنہ خدا جانے یہ نصیحت کب ختم ہوتی۔ مجھے آج کا کھانا بالکل بے مزہ معلوم ہوا۔ جب پاس ہو جانے پر یہ لتاڑ پڑتی ہے تو کہیں فیل ہو جاؤں تو یہ حضرت زندہ ہی نہ چھوڑیں گے۔ انہوں نے اپنے درجے کی پڑھائی کی جو ہیبت ناک تصویر کھینچی اس نے مجھے سچ مچ لرزا دیا کیسے اسکول چھوڑ کر گھر نہیں بھاگا یہی تعجب ہے لیکن یہ سب درگت ہونے پر بھی کتابوں سے میری بیزاری بدستور قائم رہی' کھیل کود کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا پڑھتا بھی تھا' مگر بہت کم' بس اتنا کہ روز کا کام ختم ہو جائے اور درجہ میں ذلیل نہ ہونا پڑے اپنے اوپر اعتماد پیدا ہوا تھا وہ پھر فنا ہو گیا اور پھر چوروں کی سی زندگی بسر ہونے لگی۔

پھر سالانہ امتحان ہوا اور کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ میں پھر پاس ہو گیا اور بیچارے بھائی صاحب پھر فیل ہو گئے۔ میں نے محنت زیادہ نہیں کی' مگر خدا جانے کیسے درجہ میں اول گیا مجھے خود تعجب ہوا بھائی صاحب نے حیرت انگیز محنت کی تھی دس بجے رات تک ادھر چار بجے صبح سے' پھر ادھر چھ سے ساڑھے نو تک' اسکول جانے کے قبل چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ مگر فیل۔ مجھے ان پر رحم آتا تھا۔ نتیجہ سنایا گیا تو رو پڑے میں بھی رونے لگا۔

میرے اور بھائی صاحب کے درمیان اب صرف ایک درجہ کا تفاوت رہ گیا۔

میرے دل میں ایک بیہودہ خیال یہ پیدا ہوا کہ کہیں بھائی صاحب ایک سال اور فیل ہو جائیں تو میں ان کے برابر ہو جاؤں پھر کس بناء پر مجھے نصیحت کر سکیں گے لیکن میں نے اس خیال کو دل سے فوراً" نکال دیا۔ آخر وہ مجھے ڈانٹتے ہیں تو میری ہی بھلائی کے لئے مجھے اس وقت ناگوار لگتا ہے' ضرور مگر شاید ان کی تنبیہہ کا ہی اثر ہو کہ میں یوں دنا دن پاس ہوتا جاؤں اور اتنے اچھے نمبروں سے۔

اب کے بھائی صاحب کچھ نرم پڑ گئے تھے۔ کئی بار مجھے ڈانٹنے کا موقع پا کر بھی انہوں نے تحمل سے کام لیا۔ شاید اب انہیں خود محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ مجاز اب نہیں رہا یا رہا تو بہت کم' میری بدمعاشی بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ میں ان کے تحمل کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگا مجھے ایسا گمان ہوا کہ میں تو پاس ہی ہو جاؤں گا پڑھوں یا نہ پڑھوں' میری تقدیر اچھی ہے۔ اس لئے بھائی صاحب کے خوف سے جو تھوڑی بہت کتابیں دیکھ لیا کرتا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ مجھے کنکوے اڑانے کا نیا شوق پیدا ہو گیا تھا اور اب زیادہ تر کیا بلکہ سارا وقت اسی مشغلہ کی نذر ہوتا تھا۔ پھر بھی میں بھائی صاحب کا ادب کرتا تھا اور ان کی نظر بچا کر کنکوے اڑاتا تھا۔ ساری جزئیات درپردہ عمل میں آتی تھیں۔ میں انہیں یہ گمان کرنے کا موقع نہ دینا چاہتا تھا کہ بھائی صاحب کی وقعت اور عزت میری نظروں میں کچھ کم ہو گئی ہے۔

ایک روز شام کے وقت ہوسٹل سے دور میں ایک کنکوا لوٹنے دوڑا جا رہا تھا کہ بھائی صاحب سے میری مڈھ بھیڑ ہو گئی شاید وہ بازار سے لوٹ رہے تھے انہوں نے وہیں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولے ان بازاری لونڈوں کے ساتھ دھیلے کے کنکوے کے لئے دوڑتے ہوئے شرم نہیں آتی تمہیں۔ اس کا کچھ لحاظ نہیں کہ اب نیچی جماعتوں میں نہیں ہو بلکہ آٹھویں جماعت میں آ گئے ہو اور مجھ سے صرف ایک درجہ پیچھے ہو آخر کچھ تو اپنی پوزیشن کا خیال کرنا چاہئے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ آٹھواں درجہ پاس کر کے نائب تحصیلدار ہو جاتے تھے۔ میں کتنے ہی مڈلچیوں کو جانتا ہوں جو آج اول درجہ کے ڈپٹی کلکٹر یا سپرنٹنڈنٹ ہیں کتنے ہی

ہمارے لیڈر ہیں' بی اے اور ایم اے والے ان کے ماتحت اور ان کے پیروں ہیں اور تم اسی آٹھویں درجہ میں آ کر لونڈوں کے ساتھ کنکوے کے لئے دوڑ رہے ہو۔ افسوس ہے تمہاری اس ناعقلی پر' تم ذہین ہو' اس میں شک نہیں لیکن وہ دھن کس کام کا جس سے آدمی اپنا وقار کھو بیٹھے۔ تم اپنے دل میں سمجھتے ہو گے میں محض ان سے ایک درجہ پیچھے ہوں اور اب انہیں مجھ کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے۔ میں تمہارے اس خیال کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں اور چاہے آج تم میری جماعت میں آ جاؤ اور ممتحنوں کا یہی حال ہے تو یقیناً" اگلے سال میرے ہم جماعت ہو جاؤ گے اور شاید ایک سال بعد مجھ سے آگے نکل جاؤ۔ لیکن مجھ میں اور تم میں جو پانچ سال کا تفاوت ہے اسے تم کیا خدا بھی نہیں مٹا سکتا' میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں اور ہمیشہ بڑا رہوں گا۔ مجھے دنیا اور زندگی کا جو تجربہ ہے تو اس کے برابر کبھی نہیں آ سکو گے' چاہے تم ایم اے اور ایل ایل بی ہی کیوں نہ ہو جاؤ۔ عقل کتابیں پڑھ لینے سے ہی نہیں آتی ہماری اماں نے کوئی درجہ پاس نہیں کیا اور دادا بھی شاید پانچویں چھٹی جماعت سے آگے نہیں گئے لیکن ہم دونوں آج ساری دنیا کا علم کیوں نہ پڑھ لیں اماں اور دادا کو ہمیں تنبیہہ کرنے کا ہمیشہ اختیار رہے گا۔ محض اس لئے نہیں کہ وہ بزرگ ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ تجربہ کار ہیں اور رہیں گے۔ امریکہ میں کس طرح کی حکومت ہے؟ اور ہنری ہشتم نے کتنی شادیاں کیں' اور آسمان میں کتنے ستارے ہیں یہ باتیں انہیں نہ معلوم ہوں۔ لیکن ہزاروں ایسی باتیں جن کا علم انہیں ہم سے زیادہ ہے آج میں خدانخواستہ بیمار ہو جاؤں تو تمہارے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے۔ سوائے دادا کو تار دینے کے تمہیں اور کچھ نہ سوجھے گا۔ لیکن تمہاری جگہ دادا ہوں گے تو کسی کو تار نہ دیں گے بلکہ خود مرض پہچانیں گے اور خود علاج کریں گے۔ اور اگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو کسی ڈاکٹر کو بلائیں گے گھبرائیں گے نہیں' بدحواس نہ ہوں گے۔ ہمارے خرچ کے لئے وہ کچھ بھیجتے ہیں' اسے ہم بیس بائیس تاریخ تک خرچ کر کے پیسے پیسے کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ ناشتہ بند کر دیتے ہیں'

دھوبی اور نائی سے منہ چراتے ہیں لیکن جتنا آج ہم اور تم خرچ کر رہے ہیں اس کے نصف میں دادا نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ عزت اور نیک نامی کے ساتھ بسر کیا ہے اور اپنے کنبہ کی پرورش کی ہے جس میں سب ملا کر نو آدمی تھے۔ یہ غرور دل سے نکال ڈالو کہ تم قریب آ گئے اور اب خود مختار ہو۔ میرے دیکھتے تم کبھی اپنی زندگی برباد نہ کر پاؤ گے۔ میں جانتا ہوں تمہیں میری باتیں زہر لگ رہی ہیں۔ میں نے ان کی بزرگی کا احساس کرتے ہوئے اپنی ناسعادت مندی پر نادم ہو کر چشم نم کہا ہرگز نہیں' آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ معقول ہے اور آپ کو اس کے کہنے کا حق ہے۔

بھائی صاحب نے مجھے شفقت کی نظروں سے دیکھا اور مجھے گلے لگا لیا اور بولے کنکوئے اڑانے کو منع نہیں کرتا میرا جی بھی کبھی کبھی کنکوے اڑانے کو للچاتا ہے ---- خود بے راہ چلوں گا تو تمہیں ہدایت کیسے کروں۔ یہ تو فرض میرے سر پر ہے۔

اتفاق سے اس وقت ایک کنکوا ہمارے اوپر سے گزرا اس کی ڈور لٹک رہی تھی بھائی صاحب لپکے تھے اچھل کر اس کی ڈور پکڑ لی اور اسے لئے ہوئے ہوسٹل کی طرف دوڑے میں پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

خانہ داماد

جیٹھ کا دوپہر تھا۔ ہری دھن ایک کھیت میں پانی دے آیا اور باہر بیٹھا رہا۔ گھر میں سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا اور ساتھ ہی کھن کھن کی آواز بھی آ رہی تھی۔ اس کے دونوں سالے اس کے بعد آئے اور گھر میں چلے گئے ان دونوں کے لڑکے بھی آئے اور اسی طرح گھر میں داخل ہو گئے۔ مگر ہری دھن اندر نہ جا سکا ادھر ایک مہینہ سے اس کے ساتھ جو برتاؤ ہو رہا تھا اور خصوصاً کل اسے جیسی ڈانٹ سہنی پڑی تھی' وہ اس کے پیروں میں بیڑیاں سی ڈالے ہوئے تھی۔ کل اس کی ساس ہی نے تو کہا تھا کہ میرا جی تم سے گھبرا گیا۔ میں کوئی تمہاری زندگی بھر کا ٹھیکہ لئے بیٹھی ہوں؟ سب سے بڑھ کر اس کی بیوی کے بے دردانہ سلوک نے اس کے دل کو پاش پاش کر دیا تھا۔ وہ بیٹھی ہوئی اس ساری ڈانٹ پھٹکار کو سنتی رہی مگر اس کے منہ سے ایک مرتبہ کو بھی تو نہ نکلا کہ اماں؟ تم کیوں ان کی بے عزتی کر رہی ہو؟ چپ چاپ بیٹھی

سنتی رہی۔ شاید میری درگت پر وہ خوش ہو رہی تھی۔ اس گھر میں وہ کیسے جائے کیا پھر وہی گالیاں کھانے' وہی دل آزار باتیں سننے کے لئے اور آج اس گھر میں زندگی کے دس سال گزر جانے پر یہ حال ہو رہا ہے۔ کیا میں کسی سے کم کام کرتا ہوں؟ دونوں سالے میٹھی نیند سوتے رہتے ہیں' اور میں بیلوں کو چارہ پانی دیتا ہوں۔ چھانٹی کاٹتا ہوں۔ وہاں سب لوگ پل پل پر چلم پیتے ہیں۔ میں آنکھیں بند کئے اپنے کام میں لگا رہتا ہوں۔ شام کو گھر والے گانے بجانے چلے جاتے ہیں۔ میں بڑی رات تک گائیں' بھینس دوہتا رہتا ہوں۔ ان سب کاموں کے لئے یہ انعام مل رہا ہے۔ کہ کوئی مجھے کھانے کو نہیں پوچھتا۔ الٹی اور گالیاں سننے کو ملتی ہیں۔

اس کی عورت گھر سے ڈول لے کر نکلی اور بولی' "ذرا اسے کنویں سے کھینچ تو لو' گھر میں ایک بوند پانی نہیں ہے۔"

ہری دھن ڈول لے کر کنویں پر گیا' اور پانی بھر لایا۔

اسے زور سے بھوک لگ رہی تھی' سمجھا اب کھانے کو بلانے آوے گی۔ مگر عورت ڈول لے کر اندر گئی تو وہیں کی وہ رہی۔ ہری دھن تھکا ماندہ بھوک سے بے قرار پڑا سو گیا۔

دفعتاً" اس کی بیوی نے آکر جگایا۔

ہری دھن نے پڑے پڑے کہا۔ کیا ہے۔ کیا پڑا بھی رہنے دے گی کیا اور پانی چاہئے؟

گمانی سخت لہجہ میں بولی "نظر آتے کیوں ہو' کھانے کو بلانے آئی ہوں۔"

ہری دھن نے دیکھا اس کے دونوں سالے اور بڑے سالے کے دونوں لڑکے کھانا کھائے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے بدن میں آگ لگ گئی۔ میری اب یہ نوبت پہنچ گئی کہ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی نہیں کھا سکتا۔ یہ لوگ مالک ہیں' میں ان کی جھوٹی پتیلی چاٹنے والا ہوں۔ میں ان کا کتا ہوں' جسے کھانے کے بعد روٹی کا ٹکڑا پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ ہی گھر ہے یہاں آج سے دس برس پہلے اس کی کتنی آؤ بھگت

ہوتی تھی۔ سالے غلام بنے رہتے تھے۔ ساس منہ چومتی رہتی تھی۔ بیوی پوجا کرتی تھی۔ تب اس کے پاس روپیہ تھا۔ جائیداد تھی۔ اب وہ مفلس ہے' اس کی ساری جائیداد کو ان ہی لوگوں نے برباد کر دیا۔ اب اسے روٹیوں کے بھی لالے پڑے ہیں۔ اس کے دل میں ایک شعلہ سا بھڑک اٹھا کہ اسی وقت اندر جا کر ساس اور سالوں کی خوب لعنت ملامت کرے مگر ضبط کر کے رہ گیا۔ پڑے پڑے بولا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے۔ آج نہیں کھاؤں گا۔"

گمانی نے کہا "نہ کھاؤ گے میری بلا سے! ہاں نہیں تو! کھاؤ گے تو تمہارے ہی پیٹ میں جائے گا کچھ میرے پیٹ میں تھوڑا چلا جائے گا۔

ہری دھن کا غصہ آنسو بن گیا۔ یہ میری بیوی ہے جس کے لئے میں نے اپنا سب کچھ سواہا کر دیا۔ مجھے الو بنا کر اب یہ سب لوگ نکال دینا چاہتے ہیں۔ وہ اب کہاں جائے کیا کرے؟

اس کی ساس آ کر بولی۔ "چل کر کھا کیوں نہیں لیتے جی۔ روٹھے کس سے ہو؟ یہاں تمہارے نخرے اٹھانے کا کسی میں بل بوتہ نہیں ہے۔ جو دیتے ہو وہ نہ دینا' اور کیا کرو گے تم کو بیٹی بیاہی ہے' کچھ تمہاری زندگی بھر کا ٹھیکہ تو نہیں لیا ہے۔

ہری دھن نے پیچ و تاب کھا کر کہا۔ "ہاں اماں غلطی تھی۔ میں ویسا ہی سمجھ رہا تھا۔ ارے میرے پاس دھرا ہی کیا ہے کہ تم میری زندگی کا ٹھیکہ لو گی۔ جب میرے پاس روپیہ تھا۔ میں سب کچھ تھا۔ اب غریب ہوں تو تم کیوں بات پوچھو گی۔"

بوڑھی ساس منہ پھلائے ہوئے چلی گئی۔

بچوں کے لئے باپ ایک فالتو سی چیز' ایک تکلف ہے۔ جیسے گائے کے لئے کھلی یا بابوؤں کے لئے چٹنی۔ ماں دال روٹی ہے۔ چٹنی عمر بھر نہ ملے تو ہرج ہی کیا ہے؟ مگر روٹی دال ایک دن بھی نہ ملے تو پھر دیکھے کیا حال ہوتا ہے۔ باپ کا درشن کبھی کبھی' شام مل جاتا ہے۔ وہ بچہ کو اچھالتا ہے' پیار کرتا ہے اور کبھی اسے گود میں لے کر انگلی

پکڑ کر سیر کرانے لے جاتا ہے یہ بھی اس کے فرائض کی حد ہے' وہ پردیس چلا جائے بچہ کو پروا نہیں ہوتی۔ مگر ماں تو بچے کے لئے سبھی کچھ ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ باپ کہیں ہو اسے پروا۔ نہیں اسے تو صرف ایک اچھالنے کدانے والا آدمی چاہئے۔ مگر ماں تو اس کی اپنی ہی ہونی چاہئے۔ سولہ آنے اپنی' وہی روپ رنگ' وہی پیار' وہی سب کچھ ہے مگر وہ نہیں ہے تو گویا بچہ کی زندگی کا چشمہ خشک ہو جاتا ہے۔ پھر تو وہ شیوجی کا ناریل ہے۔ جس پر پھول چڑھانا لازمی نہیں محض اختیاری ہے۔

ہری دھن کی اماں کا آج دس سال ہوئے انتقال ہو گیا تھا' اس وقت وہ بیاہا جا چکا تھا۔ وہ سولہ سال کا تھا مگر ماں کے مرتے ہی اسے معلوم ہوا کہ میں کتنا بے کس ہوں' جیسے گھر پر اس کا حق ہی نہ رہا ہو۔ بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بھائی کوئی نہ تھا؟ بے چارہ تنہا گھر میں جاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ اماں کے لئے روتا تھا' مگر ماں کے سایہ سے خوف کھاتا تھا۔ جس کوٹھری میں اس کی جان نکلی تھی ادھر وہ نظر تک نہ اٹھاتا تھا۔ گھر میں بوا تھی' جو ہری دھن کو بہت چاہتی تھی۔ اسے اب دودھ زیادہ ملتا تھا۔ کام کم کرنا پڑتا تھا۔ بوا بار بار پوچھتی بیٹا کیا کھاؤ گے؟ باپ بھی اسے کچھ پیسے دیتا کہ جس طرح چاہے خرچ کرے مگر یہ سارے مرہم اس زخم کو مندمل نہ کر سکتے تھے۔ جس نے دل کو مجروح کر دیا تھا۔ یہ لاڈ پیار بار بار اس کی ماں کی یاد دلاتا۔ ماں کی جھڑکیوں میں جو مزہ تھا وہ کیا اس پیار میں تھا؟ پہلے وہ تندرست تھا' مانگ مانگ کر کھاتا تھا۔ لڑ لڑ کر کھاتا تھا۔ اب وہ بیمار تھا۔ اچھی سے اچھی چیزیں دی جاتی تھیں' مگر اسے بھوک نہیں ہے۔

سال بھر تک وہ اسی حالت میں رہا' پھر تغیر واقع ہوا۔ ایک نئی عورت جسے لوگ اس کی ماں کہتے تھے' اس کے گھر میں آئی اور دیکھتے دیکھتے ایک کالی گھٹا کی طرح اس کی چھوٹی سی دنیا پر چھا گئی۔ ساری ہریالی' سارے اجالے پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا۔ ہری دھن نے اس نقلی ماں سے بات تک نہ کی' اس کے پاس کبھی گیا تک نہیں۔ ایک روز

گھر سے نکلا اور سسرال چلا گیا۔

باپ نے بار بار بلایا مگر اس کے جیتے جی وہ پھر گھر نہ گیا۔ جس دن باپ کے انتقال کی خبر اسے ملی ایک حسد آمیز مسرت ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔

اس نئی دنیا میں آکر ہری دھن کو پھر ایک مرتبہ ماں کی محبت کا سا سکھ ملا۔ اس کی ساس نے کسی وردان کی طرح اس کی بے لطف زندگی کو دلچسپیوں سے معمور کر دیا۔ اس میں ہریالی پیدا ہو گئی۔ سالیوں کی چھیڑ چھاڑ میں اس کی شفقت میں' سالوں کے مذاق میں اور بیوی کی محبت میں اس کے دل کی ساری مرادیں پوری ہو گئیں۔ ساس کہتی بیٹا تم اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو میری آنکھوں کے تارے ہو۔ وہ اس سے اپنے لڑکوں کی بیویوں کی شکایت کرتی۔ وہ دل میں سمجھتا تھا کہ ساس مجھے اپنے بیٹوں سے زیادہ چاہتی ہے باپ کے مرتے ہی وہ گھر گیا۔ اور اپنے حصہ کی جائیداد فروخت کر کے روپیہ کی تھیلی لئے ہوئے پھر واپس آگیا۔ اس کی دوگنی قدرو منزلت ہونے لگی۔ اس نے اپنی ساری پونجی ساس کے چرنوں پر رکھ کر اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھا۔ اب تک اسے گھر کی یاد آجاتی تھی۔ اب بھول کر بھی اس کی یاد نہ آتی تھی۔ گویا وہ گھر اس کی زندگی کا خوفناک واقعہ تھا جسے بھول جانا ہی بہتر تھا۔ وہ سب سے زیادہ کام کرتا۔ اس کی محنت و تندہی دیکھ کر گاؤں کے لوگ دانتوں تلے انگلی دبا لیتے تھے۔ اس کے خسر کی قسمت کو سراہتے جسے ایسا داماد ملا تھا۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے اس کی خاطر داری میں کمی واقع ہوتی گئی وہ پہلے دیوتا تھا' پھر گھر کا آدمی اور بالآخر گھر کا غلام ہو کر رہا۔ روٹیوں میں بھی خلل واقع ہوا۔ توہین ہونے لگی' اگر گھر کے لوگ بھوکے مرتے اور ان کے ساتھ ہی اسے بھی مرنا پڑتا تو اسے ذرا بھی شکایت نہ ہوتی۔ لیکن جب وہ دیکھتا کہ لوگ تو مونچھوں پر تاؤ دے رہے ہیں صرف میں ہی دودھ میں مکھی بنا دیا گیا ہوں تو اس کے دل سے آہ سرد نکل جاتی۔ ابھی وہ صرف پچیس ہی سال کا تو تھا' اتنی عمر اس گھر میں کیسے کٹے گی۔

اور تو اور اس کی بیوی نے بھی آنکھیں پھیر لیں' یہ اس کی مصیبت کا سب سے زیادہ درد ناک پہلو تھا۔

ہری دھن ادھر تو بھوکا پیاسا فکرو تشویش کی آگ میں جل رہا تھا اور ادھر مکان کے اندر ساس اور بہوؤں' سالوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ گمانی ہاں میں ہاں ملاتی جاتی تھی۔ بڑے سالے نے کہا "ہم لوگوں کی برابری کرتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ کسی نے ان کی عمر بھر کا ٹھیکا تھوڑا ہی لیا ہے۔ دس سال ہو گئے ہیں۔ اتنے دنوں میں کیا دو تین ہزار نہ کھا گئے ہوں گے؟"

چھوٹا سالا بولا "مجور (مزدور) ہو تو آدمی جھڑکے بھی' ڈانٹے بھی' اب انہیں کوئی کیا کہے نہ جانے ان سے کبھی پنڈ چھوٹے گا بھی یا نہیں۔ اپنے دل میں کہتے ہوں گے میں نے دو ہزار روپے انہیں دے رکھے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے دو ہزار روپے کب کے صاف ہو گئے۔ سوا یہ تو ایک جیو کو چاہئے۔"

ساس نے متانت سے کہا' "بھائی بھاری خوراک ہے۔"

گمانی ماں کے سر سے جوئیں نکال رہی تھی' .. بولی نکمے آدمی کو کھانے کے سوا اور کام ہی کیا رہتا ہے۔"

بڑا سالہ۔ "کھانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ جسے جتنی بھوک ہو اتنا کھائے مگر کچھ پیدا بھی تو کرنا چاہئے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ مہمانی میں کس کے دن کٹے ہیں۔"

چھوٹا سالا۔ "میں ایک دن کہہ دوں گا کہ آپ اپنی راہ لیجئے۔ آپ کا قرض نہیں کھایا ہے۔"

گمانی اپنے گھر والوں کی ایسی ایسی باتیں سن کر اپنے شوہر سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اگر وہ بار سے چار پیسے لاتا تو اس کی گھر میں کتنی آؤ بھگت ہوتی۔ وہ بھی رانی بن کر رہتی' نہ جانے کیوں نہیں باہر جا کر کماتے۔ ان کی نانی مر گئی ہے۔

گمانی کے خیالات و جذبات ابھی طفلانہ تھے۔ اس کا اپنا کوئی گھر نہ تھا۔ اسی گھر

کے نفع و نقصان کا خیال اسے بھی نہ تھا۔ وہ بھی اسی مسئلہ کو انہیں الفاظ میں سمجھتی اور انہیں نگاہوں سے دیکھتی جیسا کہ اس کے گھر والے۔ "سچ تو یہ ہے دو ہزار میں کیا کسی کو مول لیں گے۔ دس سال میں دو ہزار ہوتے ہی کیا ہیں۔ دو سو ہی تو سال بھر کے ہوئے۔ کیا دو آدمی سال بھر میں دو سو نہ کھائیں گے۔ پھر کپڑے تھے گھی سبھی کچھ تو ہے۔ دس سال ہو گئے۔ ایک پیتل کا چھلا بھی نہیں بنا۔ گھر سے نکلتے تو جیسے ان کے پران جاتے ہیں۔ جیسے پہلے پوجا ہوتی تھی ویسے ہی ہوتی رہے گی۔ یہ نہیں سوچتے کہ پہلے اور بات تھی اب اور بات ہے۔ بہو پہلے سسرال جاتی ہے' تو اس کا کتنا جائم ہوتا ہے۔ ڈولی سے اترتے ہی باجے بجتے ہیں۔ گاؤں محلہ کی عورتیں اس کا منہ دیکھنے آتی ہیں اور روپیہ بھی دیتی ہیں۔ مہینوں اسے گھر بھر سے اچھا کھانے کو ملتا ہے' اچھا پہننے کو کوئی کام نہیں لیا جاتا۔ لیکن چھ مہینے کے بعد کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔ وہ گھر کی لونڈی ہو جاتی ہے ان کے گھر میں میری بھی تو وہی درگت ہو گی' پھر رونا کاہے کا جو کہو کہ کام کرتا ہوں تو یہ تمہاری بھول ہے۔ مجبوری کی اور بات ہے آدمی ڈانٹتا بھی ہے' مارتا ہے' جب چاہتا ہے رکھتا ہے۔ جب چاہتا ہے نکال دیتا ہے' کس کر کام لیتا ہے' یہ نہیں کہ جب جی میں آیا پڑ کر سو رہے۔"

ہری ابھی پڑا ہوا اندر ہی اندر سلگ رہا ہو گا کہ اس کے دونوں سالے باہر آئے۔ بڑے سالے بولے' "بھیا اٹھو تیسرا پہل ڈھل گیا۔ کب تک سوتے رہو گے؟"

ہری دھن فورا" اٹھا اور تیز لہجہ میں کہا "کیا تم دونوں نے مجھے الو سمجھ لیا ہے۔"

دونوں ششدر رہ گئے۔ جس آدمی نے کبھی زبان نہیں کھولی ہمیشہ نوکر کی طرح ہاتھ باندھے حاضر رہا اور آج یکایک اتنا خود دار ہو جائے' یوں آستین چڑھا کر کھڑا ہو جائے۔ یہ انہیں ہوش میں لانے کے لئے کافی تھا' کچھ جواب نہ سوجھا۔

ہری دھن نے دیکھا ان دونوں کے قدم اکھڑ گئے ہیں۔ بس وہ ایک دھکا دینے کی زبردست خواہش کو روک نہ سکا۔ اسی طرح بولا۔ میرے بھی آنکھیں ہیں اندھا نہیں ہوں نہ بہرا ہوں۔ چھاتی پھاڑ کر کام کرتا ہوں۔ پھر بھی کتا سمجھا جاؤں ایسے گدھے کہیں اور ہوں گے۔"

اب بڑے سالے صاحب بھی گرم ہو پڑے۔ "تمہیں کسی نے یہاں باندھ تو نہیں رکھا ہے۔"

ہری دھن لاجواب ہو گیا کوئی بات نہ سوجھی۔

بڑے نے پھر اسی لہجہ میں کہا۔ "اگر تم یہ چاہو کہ جنم بھر مہمان بنے رہو اور تمہارا ویسا ہی ہوتا رہے تو یہ بات ہمارے بس کی نہیں ہے۔"

ہری دھن نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "کیا میں تم لوگوں سے کم کام کرتا ہوں؟"

بڑے۔ "یہ کون کہتا ہے۔"

ہری۔ "یہ تو تمہارے گھر کی ریت ہے کہ جو سب سے زیادہ کام کرے وہی بھوکوں مارا جائے۔"

بڑے۔ "تم خود کھانے نہیں گئے۔ کیا کوئی تمہارے منہ میں ڈال دیتا۔"

ہری نے ہونٹ چبا کر کہا۔ "میں خود کھانے نہیں گیا کہتے تمہیں لاج نہیں آتی؟"

بڑے نے کہا۔ "بہن تمہیں بلانے نہیں آئی۔"

ہری دھن کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ دانت پیس کر رہ گیا۔

چھوٹے سالے نے کہا۔ "اماں بھی تو آئی تھیں، تم نے کہہ دیا بھوک نہیں ہے تو کیا کرتیں؟"

ساس بھی اندر سے لپکی آ رہی تھی سن کر بولی "کتنا کہہ ہار گئی۔"

"تو نہ اٹھے تو میں کیا کروں؟"

ہری دھن نے خون اور آگ سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو میں تمہارے لڑکوں کا جھوٹا کھانے کے لئے ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ تم لوگ کھا کر میرے سامنے روکھی روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دو۔" بڑھیا نے اینٹھ کر کہا۔ "تو کیا تم میرے لڑکوں کی برابری کرو گے؟"

ہری دھن شکست کھا گیا۔ بڑھیا نے ایک جملہ کے وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کی تنی ہوئی بھویں ڈھیلی پڑ گئیں آنکھوں کی آگ مدھم پڑ گئی' پھڑکتے ہوئے نتھنے ساکت ہو گئے' کسی چوٹ کھائے ہوئے آدمی کی طرح وہ زمین پر گر پڑا۔ کیا تم میرے لڑکوں کی برابری کرو گے؟ یہ جملہ ایک لمبے بھالے کی طرح اس کے دل میں چبھا جا رہا تھا۔ نہ دل کی حد تھی نہ بھالے کی انتہا۔

کل گھر نے کھانا کھایا مگر ہری دھن نہ اٹھا۔ ساس نے منایا' سالیوں نے منایا' خسر نے منایا۔ دونوں سالے منا کر رہ گئے۔" مگر ہری دھن نہ اٹھا وہیں ... دروازے پر ایک ٹاٹ پڑا تھا" اسے اٹھا کر الگ کنوئیں پر لے گیا اور جگت پر بچھا کر پڑ رہا۔

رات زیادہ ہو چکی تھی آسمان کی فضائے بسیط میں لامحدود ستارے لڑکوں کی طرح کھیل رہے تھے کوئی ناچتا تھا کوئی کودتا تھا کوئی ہنستا تھا کوئی آنکھیں بند کر کے پھر کھول دیتا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں کوئی بہادر لڑکا ایک لمحہ میں اس وسیع میدان کو پار کر جاتا اور نہ جانے کہاں جا کر چھپ جاتا۔ ہری کو اپنا بچپن یاد آیا جب وہ اسی طرح کھیلا کرتا تھا اس کی بچپن کی یاد روشن ستاروں کی طرح چمک اٹھی۔ وہ اس کا اپنا چھوٹا سا گھر' وہ آم کا باغ جہاں کیریاں چنا کرتا تھا وہ میدان جہاں وہ کبڈی کھیلا کرتا تھا سب اسے یاد آنے لگے۔ پھر مامتا بھری ماں کی موہنی صورت اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ان کی آنکھوں میں کتنا درد تھا۔ کتنا رحم تھا۔ اسے معلوم ہوا گویا ماں آنکھوں میں آنسو بھرے اسے سینے سے لگا لینے کے لئے ہاتھ پھیلائے اس کی طرف چلی آ رہی ہے۔ وہ اسی دلکش تصور میں محو ہو کر رہ گیا۔ گویا ماں نے اس کو سینہ سے لگا لیا اور وہ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے۔ وہ رونے لگا' زار و قطار رونے لگا۔

اسی خود فراموشی کی حالت میں اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے آماں تم نے مجھے بھلا دیا۔ دیکھو تمہارے پیارے لال کی کیا درگت بن رہی ہے۔ کوئی اسے پانی کو بھی نہیں پوچھتا۔ کیا جہاں تم ہو وہاں میرے لئے جگہ نہیں ہے۔" دفعتاً" گمانی نے آکر پکارا "سو گئے تم چل کر کھا کیوں نہیں لیتے۔ کب تک کوئی تمہارے لئے بیٹھا رہے؟"

ہری اٹھ بیٹھا اور تلوار سی نیام سے نکال کر بولا۔ "بھلا تمہیں میری سدھ آئی تو۔ میں نے تو کہہ دیا تھا' مجھے بھوک نہیں ہے۔"

گمانی۔ "تو کے (کتنے) دن نہ کھاؤ گے؟"

ہری۔ "اس گھر کا پانی نہ پیوں گا۔ تجھے میرے ساتھ چلنا ہے یا نہیں؟"

ان مصمم ارادوں سے بھرے ہوئے الفاظ کو سن کر گمانی سہم اٹھی۔ بولی' کہاں جا رہے ہو؟" ہری نے گویا نشے میں کہا' تجھے اس سے کیا مطلب؟ میرے ساتھ چلے گی یا نہیں' پھر پیچھے سے نہ کہنا کہ مجھ سے نہیں کہا۔"

گمانی معترض لہجہ میں بولی "تم بتاتے کیوں نہیں کہاں جا رہے ہو؟"

"تو میرے ساتھ چلے گی یا نہیں؟"

"جب تک تم نہ بتاؤ گے میں نہ جاؤں گی۔"

"تو یہ مجھے معلوم ہو گیا تو نہیں جانا چاہتی مجھے اتنا ہی پوچھنا تھا۔ نہیں تو میں اب تک آدھی دور نکل گیا ہوتا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا' گمانی "سنو تو" پکارتی رہی مگر اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

تین میل کی مسافت ہری دھن نے پانچ گھنٹہ میں طے کی۔ جب وہ اپنے گاؤں کے آم والے باغوں کے قریب پہنچا تو اس کی ماں کی یاد سے بھرا ہوا تخیل افق کی سنہری گود میں کھیل رہا تھا۔ ان درختوں کو دیکھ کر اس کا دل بے قرار ناچنے لگا۔ مندر کا سنہرا کلس دیکھ کر وہ اس طرح دوڑا گیا کہ ایک جست میں وہ اوپر جا پہنچا۔ وہ تیزی

سے دوڑا جا رہا تھا گویا اس کی ماں آغوش کھولے بلا رہی ہو۔ جب وہ آموں کے باغ میں پہنچا' جہاں ڈالیوں پر بیٹھنے سے اسے ہاتھی کی سواری کا مزہ ملتا تھا۔ جہاں کچے بیر اور لسوڑوں میں ایک روحانی لذت تھی تو وہ بے اختیار بیٹھ گیا اور زمین پر سر جھکا کر رونے لگا۔ گویا ماں کو اپنی مصیبت کی داستان سنا رہا تھا۔ وہاں کی ہوا میں وہاں کی روشنی میں گویا اس کی ماں کی ایک بہت بڑی سی مورت بس رہی تھی۔ وہاں کی چپہ چپہ زمین ماں کے قدموں کے نشانات سے مقدس بنی ہوئی تھی۔ ماں کی محبت بھرے الفاظ گویا اب تک اس فضاء میں گونج رہے تھے۔ وہاں کی آب و ہوا میں نہ جانے کون سا امرت تھا جس نے اس کے افسردہ دل کو ایک مرتبہ پھر امنگوں سے بھر دیا۔ وہ ایک درخت پر چڑھ گیا اور آم توڑ توڑ کھانے لگا۔ ساس کی وہ سخت کلامی بیوی کی وہ بے اعتنائی اور ساری ذلت یہ سب باتیں وہ بھول گیا۔ اس کے پاؤں پھول رہے تھے' تلوے جل رہے تھے' مگر اس مسرت کی محویت میں اسے کسی بات کا خیال نہ تھا۔

اس نے گالیاں بھی دیں۔ مگر ان گالیوں میں اس وقت ہری دھن کو بڑا لطف آ رہا تھا۔ وہ ڈالیوں میں چھپ گیا۔ اس نے کئی آم کاٹ کر گرائے اور زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ایسی خوشی سے بھری ہوئی ہنسی اس نے بہت دنوں سے نہ ہنسی تھی۔

رکھوالے کو وہ ہنسی پہچانی ہوئی سی معلوم ہوئی مگر ہری دھن یہاں کہاں وہ تو سسرال کی روٹیاں توڑ رہا ہے کیسا ہنسوڑ تھا' کتنا چلبلا' نہ جانے بچارے کا کیا حال ہو؟ پیڑ کی ڈال سے تالاب میں کود پڑتا تھا۔ اب گاؤں میں ایسا کون ہے؟"

ڈانٹ کر بولا۔ "وہاں بیٹھے بیٹھے ہنسو گے تو ساری ہنسی نکال دوں گا نہیں تو سیدھے اتر آؤ۔"

وہ گالیاں دینے ہی والا تھا کہ ایک گٹھلی آکر اس کے سر پر لگی۔ وہ سر سہلاتا ہوا بولا یہ کون شیطان ہے۔ نہیں مانتا ٹھہرو میں آکر خبر لیتا ہوں" اس نے اپنی لاٹھی نیچے رکھ دی اور بندروں کی طرح جھٹ اوپر چڑھ گیا۔ دیکھا تو ہری دھن بیٹھا مسکرا رہا ہے۔ متحیر ہو کر بولا' "ارے ہری دھن تم یہاں کب آئے؟ اس پیڑ پر کب سے بیٹھے

ہو؟"

دونوں بچپن کے ساتھی وہیں گلے ملے۔

"یہاں کب آئے؟ چلو گھر چلو' بھلے آدمی! کیا وہاں آم بھی میسر نہ ہوتے تھے۔"

ہری دھن نے مسکرا کر کہا۔ "منگرو ان آموں میں جو سواد اور لذت ہے اور کہیں کے آموں میں نہیں ہے۔ گاؤں کا کیا رنگ ڈھنگ ہے۔"

منگرو۔ "سب چین ہے بھیا' تم نے تو جیسے ناتا ہی توڑ دیا۔ اس طرح کوئی اپنا گاؤں گھر چھوڑ دیتا ہے۔ جب سے تمہارے دادا مرے ساری گر ہستی چوٹ ہو گئی اور چھوٹے چھوٹے لڑکے ہیں ان کے کیا ہوتا ہے۔"

ہری دھن۔ "مجھے اب اس گر ہستی سے کیا واسطہ ہے؟ بھائی میں تو اپنا لے دے چکا۔ مجوری تو ملے گی نا۔ تمہاری گیا (گائیں) میں ہی چرایا کروں گا مجھے کھانے کو دے دینا۔"

منگرو نے شک کے لہجہ میں کہا' "ارے بھیا کیسی باتیں کرتے ہو؟ تمہارے لئے جان تک حاضر ہے۔ کیا سسرال میں نہ رہو گے؟ کوئی چنتا نہیں' پہلے تو تمہارا ہی گھر ہے اسے سنبھالو۔ چھوٹے بچے ہیں۔ ان کو پالو۔ تم نئی اماں سے نایک (ناحق) ڈرتے تھے بڑی سیدھی ہیں بچاری' بس اپنی ماں ہی سمجھو' تمہیں پا کر تو نہال ہو جائیں گی' اچھا گھر والی کو بھی تو لاؤ گے؟"

ہری دھن۔ "اس کا منہ اب نہ دیکھوں گا میرے لئے وہ مر گئی۔"

منگرو۔ "تو دوسری سگائی ہو جائے گی۔ اب کے ایسی عورت لا دوں گا کہ اس کے پیر دھو کر پیو گے۔ پر کہیں پہلی آ گئی تو؟"

ہری دھن۔ "وہ نہ آئے گی۔"

ہری دھن اپنے گھر پہنچا تو دونوں بھائی بھائی کہتے ہوئے اندر دوڑے گئے اور ماں کو خبر دی۔ اس گھر میں قدم رکھتے ہی ہری دھن کو ایسے دلی سکون کا احساس ہوا گویا

وہ اپنی ماں کی گود میں بیٹھا ہوا ہے۔ اتنے دن ٹھوکریں کھانے سے اس کا دل نرم ہو گیا تھا۔ جہاں پہلے گھمنڈ تھا' ضد تھی' شیخی تھی' وہاں اب مایوسی تھی شکست تھی اور طلب تھی۔ مرض کا زور گھٹ چلا تھا۔ اب اس پر معمولی دوا بھی اثر کر سکتی تھی۔ قلعہ کی دیواروں میں سوراخ ہو گئے تھے' اب اس میں داخل ہو جانا مشکل نہ تھا۔ وہی گھر جس سے وہ ایک دن برداشتہ خاطر ہو چکا تھا۔ اب آغوش کھولے ہوئے اسے پناہ دینے کے لئے تیار تھا۔ بے یارو مددگار ہری دھن اس سہارے کو پا کر بالکل مطمئن ہو گیا۔

شام کو اس کی سوتیلی ماں نے کہا۔ "بیٹا تم گھر آ گئے۔ ہمارا دھینہ بھاگ' اب ان بچوں کو پالو' ماں کا ناتا نہ سہی' باپ کا ناتا تو ہے۔ مجھے ایک روٹی دے دینا کھا کر ایک کونے میں پڑی رہوں گی۔ تمہاری اماں سے بہن کا ناتا ہے۔ اس ناتے بھی تم میرے لڑکے ہی ہوتے ہو۔"

ماں کے لئے ترسنے والے ہری دھن کو سوتیلی ماں کے روپ میں اپنی ہی ماں کا درشن ہوا۔ گھر کے ایک ایک گوشے میں ماں کی یاد کا جلوہ چاندنی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ وہی سوتیلی ماں کے چہرے پر نظر آ رہا تھا۔

دوسرے روز ہری دھن پھر کندھے پر ہل رکھے ہوئے کھیت کو چلا' اس کے چہرے پر خوشی تھی اور آنکھوں میں غرور تھا۔ اب وہ کسی کا سہارا لینے والا نہیں بلکہ سہارہ دینے والا تھا کسی کے در کا بھکاری نہیں بلکہ اپنے گھر کا نگہبان تھا۔

ایک روز اس نے سنا کہ گمانی نے دوسرا شوہر کر لیا۔ وہ ماں سے بولا "تم نے سنا کاکی گمانی نے دوسرا گھر بسا لیا۔"

کاکی نے کہا۔ "گھر کیا کرے گی ٹھٹھا ہے۔ برادری میں ایسا اندھیر' پنچایت نہیں عدالت تو ہے۔"

ہری نے کہا۔ "نہیں کاکی بہت اچھا ہوا' لاؤ مہابیر سوامی کو لڈو چڑھاؤں۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ میرے گلے نہ آ پڑے۔ بھگوان نے میری سن لی' میں وہاں سے اپنے من

میں ٹھان کر چلا تھا کہ اب کبھی اس کا منہ نہ دیکھوں گا۔"

عید گاہ

رمضان کے پورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی کتنی سہانی اور رنگین صبح ہے بچہ کی طرح پر تبسم درختوں پر کچھ عجیب ہریاول ہے۔ کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے' آج کا آفتاب دیکھ کتنا پیارا ہے گویا دنیا کو عید کی خوشی پر مبارک باد دے رہا ہے' گاؤں میں کتنی چہل پہل ہے۔ عید گاہ جانے کی دھوم ہے کسی کے کرتے میں بٹن نہیں ہیں تو سوئی تاگا لینے دوڑا جا رہا ہے۔ کسی کے جوتے سخت ہو گئے ہیں۔ اسے تیل اور پانی سے نرم کر رہا ہے۔ جلدی جلدی بیلوں کو سانی پانی دے دیں۔ عید گاہ سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو جائے گی۔ تین کوس کا پیدل راستہ پھر سینکڑوں رشتے قرابت والوں سے ملنا ملانا۔ دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن ہے۔ لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔ کسی نے ایک روزہ رکھا۔ وہ بھی دوپہر تک۔ کسی نے وہ بھی نہیں۔ لیکن عید گاہ جانے کی خوشی ان کا حصہ ہے' روزے بڑے بوڑھوں کے لیے ہوں گے

بچوں کے لیے تو عید ہے۔ روز عید کا نام رٹتے تھے آج وہ آ گئی۔ اب جلدی پڑی ہوئی ہے۔ کہ عید گاہ کیوں نہیں چلتے۔ انھیں گھر کی فکروں سے کیا واسطہ؟ سویوں کے لیے گھر میں دودھ اور شکر میوے ہیں یا نہیں۔ اس کی انھیں کیا فکر؟ وہ کیا جانیں ابا کیوں بدحواس گاؤں کے مہاجن چودھری قاسم علی کے گھر دوڑے جا رہے ہیں ان کی اپنی جیبوں میں تو قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ بار بار جیب سے اپنا خزانہ نکال کر گنتے ہیں۔ دوستوں کو دکھاتے ہیں اور خوش ہو کر رکھ لیتے ہیں۔ ان ہی دو چار پیسوں میں دنیا کی سات نعمتیں لائیں گے۔ کھلونے اور مٹھائیاں اور بگل اور خدا جانے کیا کیا اور سب سے زیادہ خوش ہے حامد۔ وہ چار سال کا غریب صورت بچہ ہے جس کا باپ پچھلے سال ہیضہ کی نذر ہو گیا تھا اور ماں نہ جانے کیوں زرد ہوتی ہوتی ایک دن مر گئی کسی کو پتہ نہ چلا کہ بیماری کیا ہے۔ کہتی کس سے کون سننے والا تھا۔؟ دل پر جو گزرتی تھی سہتی تھی۔ اور جب نہ سہا گیا تو دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب حامد اپنی بوڑھی دادی امینہ کی گود میں سوتا ہے اور اتنا ہی خوش ہے اس کے ابا جان بڑی دور روپے کمانے گئے تھے بہت سی تھیلیاں لے کر آئیں گے۔ امی جان اللہ میاں کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں۔ اس لیے خاموش ہے۔ حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں۔ سر پر ایک پرانی دھرانی ٹوپی ہے جس کا گوٹہ سیا ہو گیا ہے۔ پھر بھی وہ خوش ہے جب اس کے ابا جان تھیلیاں اور اماں جان نعمتیں لے کر آئیں گے تب وہ دل کے ارمان نکالے گا تب دیکھے گا کہ محمود اور محسن آذر اور سمیع کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں۔ دنیا میں مصیبتوں کی ساری فوج لے کر آئے' اس کی ایک نگاہ معصوم اسے پامال کرنے کے لیے کافی ہے۔"

حامد اندر جا کر امینہ سے کہتا ہے۔"تم ڈرنا نہیں اماں میں گاؤں والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ بالکل نہ ڈرنا۔ لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا۔ گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ حامد کیا اکیلا ہی جائے گا۔ اس بھیڑ بھار میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو نہیں امینہ اسے تنہا نہ جانے دے گی۔ ننھی سی جان۔ تین کوس چلے

گا- پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے۔

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سویاں کون پکائے گا' بھوکا پیاسا دوپہر کو لوٹے گا' کیا اس وقت سویاں پکانے بیٹھے گی- رونا تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں- اس نے فہمین کے کپڑے سئے تھے- آٹھ آنے پیسے ملے تھے- اس اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی آئی تھی اس عید کے لیے' لیکن گھر میں پیسے اور نہ تھے اور گوالن کے پیسے اور چڑھ گئے تھے- دینے پڑے- حامد کے لیے روز دو پیسے کا دودھ تو لینا پڑتا ہے اب کل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں- تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ امینہ کے بٹوے میں یہی بساط ہے- اللہ ہی بیڑا پار کرے گا- دھوبن مہترانی اور نائن بھی تو آئیں گی- سب کو سویاں چاہئیں- کس کس سے منہ چھپائے؟ سال بھر کا تہوار ہے- زندگی خیریت سے رہے ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے بچے کو خدا سلامت رکھے یہ دن بھی یوں ہی کٹ جائیں گے- گاؤں سے لوگ چلے اور حامد بھی بچوں کے ساتھ تھا- سب کے سب دوڑ کر نکل جاتے- پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ والوں کا انتظار کرتے- یہ لوگ کیوں اتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں-

شہر کا سرا شروع ہو گیا- سڑک کے دونوں طرف امیروں کے باغ ہیں- پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے- درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں- حامد نے ایک کنکری اٹھا کر ایک آم پر نشانہ لگایا- مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا- بچے وہاں سے ایک فرلانگ پر ہیں- خوب ہنس رہے ہیں- مالی کو خوب الو بنایا-

بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں- یہ عدالت ہے- یہ مدرسہ ہے- یہ کلب گھر ہے- اتنے بڑے مدرسہ میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے- لڑکے نہیں ہیں جی بڑے بڑے آدمی ہیں- سچ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں- اتنے بڑے ہو گئے اب تک پڑھنے جاتے ہیں- آج تو چھٹی ہے لیکن ایک بار جب پہلے آئے تھے- تو بہت سے داڑھی مونچھوں والے لڑکے یہاں کھیل رہے تھے- نہ جانے کب تک پڑھیں گے- اور کیا کریں گے اتنا پڑھ کر- گاؤں کے دیہاتی مدرسے میں دو تین بڑے بڑے لڑکے ہیں-

بالکل کوؤں جیسے کام سے جی چرانے والے یہ لڑکے بھی اس طرح کے ہوں گے جی۔ اور کیا نہیں کیا اب تک پڑھتے ہوتے۔ وہ کلب گھر ہے۔ وہاں جادو کا کھیل ہوتا ہے۔ سنا ہے مردوں کی کھوپڑیاں اڑتی ہیں۔ آدمی کو بے ہوش کر دیتے ہیں۔ پھر اس سے جو کچھ پوچھتے ہیں وہ سب بتلا دیتے ہیں۔ اور بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں اور میمیں بھی کھیلتی ہیں۔ سچ ہماری امان کرو دے دو۔ کیا کہلاتا ہے۔"بیٹ" تو اسے گھماتے ہی لڑھک جائیں۔

محسن نے کہا "ہماری امی جان تو اسے پکڑ ہی نہ سکیں۔ ہاتھ کانپنے لگیں۔ اللہ قسم۔"

حامد نے اس سے اختلاف کیا "چلو" منوں آٹا پیس ڈالتی ہیں۔ ذرا سی بیٹ پکڑ لیں گے تو ہاتھ کانپنے لگے گا۔ سینکڑوں گھڑے پانی روز نکالتی ہیں۔ کسی میم کو ایک گھڑا پانی نکالنا پڑے تو آنکھوں تلے اندھیرا آ جائے"

محسن لیکن دوڑتی تو نہیں' اچھل کود نہیں سکتیں۔

حامد۔ کام آپڑتا ہے تو دوڑ بھی لیتی ہیں ابھی اس دن تمھاری گائے کھل گئی تھی اور چودھری کے کھیت میں جا پڑی تھی تو تمھاری اماں ہی تو دوڑ کراسے بھگا لائی تھیں۔ کتنی تیزی سے دوڑی تھیں۔ ہم تم دونوں ان سے پیچھے رہ گئے"

پھر آگے چلے۔ حلوائیوں کی دکانیں شروع ہو گئیں۔ آج خوب سجی ہوئی تھیں۔

اتنی مٹھائیاں کون کھاتا ہے؟ دیکھو نا۔ ایک ایک دکان پر منوں ہوں گی سنا ہے رات کو ایک جن ہر ایک دکان پر جاتا ہے۔ جتنا مال بچا ہوتا ہے وہ سب خرید لیتا ہے اور سچ مچ کے روپے دیتا ہے۔ بالکل ایسے ہی چاندی کے روپے۔

محمود کو یقین نہ آیا۔ ایسے روپے جنات کو کہاں سے مل جائیں گے۔

محسن "جنات کو روپوں کی کیا کمی؟ جس خزانہ میں چاہیں چلے جائیں کوئی انھیں دیکھ نہیں سکتا۔ لوہے کے دروازے تک نہیں روک سکتے جناب آپ ہیں کس خیال میں ہیرے جواہرات ان کے پاس رہتے ہیں۔ جس سے خوش ہو گئے اسے ٹوکروں

جواہرات دے دیے۔ پانچ منٹ میں کہو کابل پہنچ جائیں۔

حامد "جناب بہت بڑے ہوتے ہوں گے۔"

محسن۔"اور کیا ایک ایک آسمان کے برابر ہوتا ہے۔ زمین پر کھڑا ہو جائے تو اس کا سر آسمان سے جا لگے۔ مگر چاہے تو ایک لوٹے میں گھس جائے۔

سمیع۔"سنا ہے چودھری صاحب کے قبضہ میں بہت سے جنات ہیں کوئی چیز چوری چلی جائے۔ چودھری صاحب اس کا پتہ بتا دیں گے۔ اور چور کا نام تک بتا دیں گے جمعراتی کا بچھڑا اس دن کھو گیا تھا۔ تین دن حیران ہوئے کہیں نہ ملا تب جھک مار کر چودھری کے پاس گئے چودھری نے کہا۔ مویشی خانہ میں ہے اور وہیں ملا۔ جنات آکر انھیں سب خبریں دے جایا کرتے ہیں:

اب ہر ایک کی سمجھ میں آگیا۔ کہ چودھری قاسم علی کے پاس کیوں اس قدر دولت ہے اور کیوں وہ قرب و جوار کے مواضعات کے مہاجن ہیں۔ جنات آکر انھیں روپے دے جاتے ہیں۔ آگے چلئے یہ پولیس لائن ہے۔ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں رائٹ لپ' بھام پھو۔

نوری نے تصحیح کی۔"یہاں پولیس والے پہرہ دیتے ہیں۔ جب ہی تو انھیں بہت خبر ہے اجی حضرت یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں۔ شہر کے جتنے چور ڈاکو ہیں سب ان سے ملے رہتے ہیں رات کو سب ایک محلہ میں چوروں سے کہتے ہیں اور دوسرے محلہ میں پکارتے ہیں جاگتے رہو۔ میرے ماموں صاحب ایک تھانہ میں سپاہی ہیں۔ بیس روپے مہینہ پاتے ہیں لیکن تھیلیاں بھر بھر گھر بھیجتے ہیں۔ میں نے ایک بار پوچھا تھا۔ ماموں اتنے روپے آپ چاہیں تو ایک دن میں لاکھوں بار لائیں۔ ہم تو اتنا ہی لیتے ہیں جس میں اپنی بدنامی نہ ہو اور نوکری بنی رہے۔

حامد نے تعجب سے پوچھا۔ "یہ لوگ چوری کراتے ہیں تو انھیں کوئی پکڑتا نہیں نوری نے اس کی کوتاہ فہمی پر رحم کھا کر کہا۔" ارے احمق انھیں کون پکڑے گا۔ پکڑنے والے تو یہ خود ہیں۔ لیکن اللہ انھیں سزا بھی خوب دیتا ہے۔ تھوڑے دن

ہوئے ماموں کے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا مال متاع جل گیا' ایک برتن تک نہ بچا کئی دن تک درخت کے سائے کے نیچے سوئے' اللہ قسم پھر نہ جانے کہاں سے قرض لائے تو برتن بھانڈے آئے۔"

بستی گھنی ہونے لگی۔ عید گاہ جانے والوں کے مجمع نظر آنے لگے۔ ایک سے ایک زرق برق پوشاک پہنے ہوئے۔ کوئی تانگے پر سوار کوئی موٹر پر چلتے تھے تو کپڑوں سے عطر کی خوشبو اڑتی تھی۔

دہقانوں کی یہ مختصر سی ٹولی اپنی بے سرو سامانی سے بے حس اپنی خستہ حالی میں مگر صابر و شاکر چلی جاتی تھی۔ جس چیز کی طرف تاکتے تاکتے رہ جاتے اور پیچھے سے بار بار ہارن کی آواز ہونے پر بھی خبر نہ ہوتی تھی۔ محسن تو موٹر کے نیچے جاتے جاتے بچا۔

وہ عید گاہ نظر آئی۔ جماعت شروع ہو گئی ہے او املی کے گھنے درختوں کا سایہ ہے نیچے کھلا ہو پختہ فرش ہے۔ جس پر جاجم بچھا ہو ہے۔ اور نمازیوں کی قطاریں ایک کے پیچھے دوسرے خدا جانے کہاں تک چلی گئی ہیں۔ پختہ فرش کے نیچے جاجم بھی نہیں۔ کئی قطاریں کھڑی ہیں۔ جو آتے جاتے ہیں پیچھے کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔ آگے اب جگہ نہیں رہی۔ یہاں کوئی رتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا۔ اسلام کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ دہقانوں نے بھی وضو کیا اور جماعت میں شامل ہو گئے۔ کتنی باقاعدہ منظم جماعت ہے' لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں ایک ساتھ دوزانو بیٹھ جاتے ہیں۔ اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا۔ بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں اور ایک ساتھ بجھ جائیں۔ کتنا پر احترام رعب انگیز نظارہ ہے۔ جس کی ہم آہنگی او وسعت اور تعداد دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ گویا اخوت کا رشتہ ان تمام روحوں کو منسلک کئے ہوئے ہیں۔

نماز ختم ہو گئی ہے لوگ باہم گلے مل رہے ہیں کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات کر رہے ہیں۔ جو آج یہاں ہزاروں جمع ہو گئے ہیں۔ ہمارے دہقانوں نے مٹھائی اور کھلونوں کی دکانوں پر یورش کی۔ بوڑھے بھی ان دلچسپیوں میں بچوں سے کم نہیں ہیں۔

یہ دیکھو ہنڈولا ہے ایک پیسہ دے کر آسمان پر جاتے معلوم ہوں گے۔ کبھی زمین پر گرتے ہیں یہ چرخی ہے لکڑی کے گھوڑے' اونٹ' ہاتھی منجوں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک پیس دے کر بیٹھ جاؤ اور پچیس چکروں کا مزہ لو۔ محمود اور محسن دونوں ہنڈولے پر بیٹھے ہیں۔ آذر اور سمیع گھوڑوں پر۔ ان کے بزرگ اتنے ہی طفلانہ اشتیاق سے چرخی پر بیٹھے ہیں حامد دور کھڑا ہے تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں۔ ذرا سا چکر کھانے کے لیے وہ اپنے خزانہ کا ٹکٹ نہیں صرف کر سکتا۔ محسن کا باپ بار بار اسے چرخی پر بلاتا ہے لیکن وہ راضی نہیں ہوتا بوڑھے کہتے ہیں اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آگیا ہے۔ حامد سوچتا ہے کیوں کسی کا احسان لوں' عسرت نے اسے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنا دیا ہے۔ سب لوگ چرخی سے اترتے ہیں۔ کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے۔ سپاہی اور گجریا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بہشتی بے امتیاز ان سے ران ملائے بیٹھے ہوئے ہیں۔ دھوبی راجہ رانی کی بغل میں ہے اور بہشتی وکیل صاحب کی بغل میں واہ کتنے خوبصورت بولا ہی چاہتے ہیں محمود سپاہی پر لٹو ہو جاتا ہے خاکی وردی اور پگڑی لال کندھے پر بندوق معلوم ہوتا ہے ابھی قواعد کے لیے چلا آرہا ہے محسن کو بہشتی پسند آیا کمر جھکی ہوئی ہے اس پر مشک کا دھانہ ایک ہاتھ نے پکڑے ہوئے ہے' دوسرے ہاتھ میں رسی ہے کتنا بشاش چہرہ ہے شاید کوئی گیت گا رہا ہے مشک سے پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے نوری کو وکیل سے مناسبت ہے کتنی عالمانہ صورت ہے سیاہ چغہ نیچے سفید اچکن' اچکن کے سینہ کی جیب میں سنہری زنجیر' ایک ہاتھ میں قانون کی کتاب لیے ہوئے ہے معلوم ہوتا ہے' ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کر کے چلے آرہے ہیں۔ یہ سب دو دو پیسے کے کھلونے ہیں۔ حامد کے پاس کل تین پیسے ہیں۔ اگر دو کا ایک کھلونا لے لے تو پھر اور کیا لے گا نہیں کھلونے فضول ہیں۔ کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چور چور ہو جائے ذرا سا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ دھل جائے۔ ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا کس مصرف کے ہیں۔

محسن کہتا ہے "میرا بہشتی روز پانی دے جائے گا صبح شام۔"

نوری "اور میرا وکیل روز مقدمے لڑے گا اور روز روپے لائے گا۔"

حامد کھلونوں کی مذمت کرتا ہے۔ مٹی کے ہی تو ہیں گریں تو چکنا چور ہو جائیں لیکن ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ذرا دیر کے لیے انھیں ہاتھ میں لے سکتا۔ یہ بساطی کی دکان ہے' طرح طرح کی ضروری چیزیں ایک چادر بچھی ہوئی ہے۔ گیند' سیٹیاں' بگل' بھنورے' ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں محسن ایک سیٹی لیتا ہے محمود گیند' نوری ربڑ کا بت جو چوں چوں کرتا ہے اور سمیع ایک خنجری اسے وہ بجا بجا کر گائے گا حامد کھڑا ہر ایک کو حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ جب اس کا رفیق کوئی چیز خرید لیتا ہے تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگتا ہے لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے۔ خاص کر جب کہ ابھی دلچسپی تازہ ہے۔ بے چارہ یوں ہی مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا کسی نے ریوڑیاں لی ہیں کسی نے گلاب جامن کسی نے سوہن حلوہ مزہ سے کھا رہے ہیں۔ ان کی برادری سے خارج ہے۔ کمبخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا۔ حریص نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔

محسن نے کہا"حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوشبودار ہیں"؟

حامد سمجھ گیا یہ محض شرارت کے محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا پھر بھی وہ اس کے پاس گیا محسن نے دو نے سے دو تین ریوڑیاں نکالیں حامد کی طرف بڑھائیں حامد نے ہاتھ پھیلایا محسن نے ہاتھ کھینچ لیا اور ریوڑیاں اپنے منھ میں رکھ لیں۔ محمود اور نور اور سمیع خوب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے حامد کھسیانہ ہو گیا محسن نے کہا۔

اچھا اب ضرور دیں گے یہ لے جاؤ اللہ قسم۔"

حامد نے کہا"رکھیے رکھیے کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"؟

سمیع بولا"تین ہی پیسے تو ہیں کیا کیا لو گے۔"؟

محمود"تم اس سے مت بولو حامد میرے پاس آؤ یہ گلاب جامن لے لو"

حامد "مٹھائی کون سی بڑی نعمت ہے کتاب میں اس کی برائیاں لکھی ہیں"
محسن "لیکن جی میں کہہ رہے ہو گے کہ کچھ مل جائے تو کھالیں اپنے پیسے کیوں نہیں نکالتے۔"

محمود "اس کی ہوشیاری میں سمجھتا ہوں۔ جب ہمارے سارے پیسے خرچ ہو جائیں گے تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑا چڑا کر کھائے گا۔"

حلوائیوں کی دکانوں کے آگے کچھ دکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں کچھ گلٹ اور ملمع کے زیورات کی۔ لڑکوں کے لیے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا حامد لوہے کی دکان پر ایک لمحہ کے لیے رک گیا۔ دست پناہ رکھے ہوئے تھے وہ دست پناہ خرید لے گا۔ ماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے توے سے روٹیاں اتارتی ہیں تو ہاتھ جل جاتا ہے اگر وہ دست پناہ لے جاکر اماں کو دیدے تو وہ کتنی خوش ہوں گی پھر ان کی انگلیاں کبھی نہیں جلیں گی، گھر میں ایک کام کی چیز ہو جائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ مفت میں پیسے خراب ہوتے ہیں ذرا دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے پھر تو انھیں کوئی آنکھ اٹھا کر کبھی نہیں دیکھتا یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ کر برباد ہو جائیں گے یا چھوٹے بچے جو عید گاہ نہیں جا سکتے ہیں ضد کر کے لے لیں گے اور توڑ ڈالیں گے۔ دست پناہ کتنے فائدہ کی چیز ہے روٹیاں توے سے اتار لو، چولھے سے آگ نکال کر دے دو۔ اماں کو فرصت کہاں ہے بازار آئیں اور اتنی پیسے کہاں ملتے ہیں روز ہاتھ جلا لیتی ہیں اس کی ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ سبیل پر سب کے سب پانی پی رہے ہیں کتنے لالچی ہیں سب نے اتنی مٹھائیاں لیں کسی نے مجھے ایک بھی نہ دی۔ اس پر کہتے ہیں میرے ساتھ کھیلو۔ میری تختی دھولاؤ۔ اب اگر یہاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا، کھائیں مٹھائیاں آپ ہی منہ سڑے گا۔ پھوڑی پھنسیاں نکلیں گی آپ ہی زبان چٹوری ہو جائے گی، تب پیسے چرائیں گے اور مار کھائیں گے میری زبان کیوں خراب ہوگی اس نے پھر سوچا اماں دست پناہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ہاتھ سے لے لیں گی اور کہیں گی میرا بیٹا اپنی ماں کے لیے دست پناہ لایا ہے ہزاروں دعائیں دیں گی۔ پھر اسے پڑوسیوں

کو دکھائیں گی سارے گاؤں میں واہ واہ مچ جائے گی۔ ان لوگوں کے کھلونوں پر کون انھیں دعائیں دے گا۔ بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگا میں پہنچتی ہیں اور فوراً" قبول ہوتی ہیں۔ میرے پاس بہت سے پیسے نہیں ہیں جب ہی تو محسن اور محمودیوں مزاج دکھاتے ہیں' میں بھی ان کو مزاج دکھاؤں گا۔ وہ کھلونے کھیلیں مٹھائیاں کھائیں میں غریب سہی۔ کسی سے کچھ مانگنے تو نہیں جاتا۔ آخر ابا کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی پھر ان لوگوں سے پوچھوں گا کتنے کھلونے لو گے ایک ایک کو ایک ٹوکری دوں اور دکھا دوں کہ دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے جتنے غریب لڑکے ہیں سب کو اچھے اچھے کرتے دلوا دوں گا' اور کتابیں دے دوں گا' یہ نہیں کہ ایک پیسہ کی ریوڑیاں لیں۔ تو چڑا چڑا کر کھانے لگیں۔

دست پنا دیکھ کر سب کے سب ہنسیں گے۔ احمق تو ہیں ہی سب اس نے ڈرتے ڈرتے دکاندار سے پوچھا"یہ دست پناہ بیچو گے۔"

دوکاندار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا وہ تمھارے کام کا نہیں ہے"

"بکاؤ ہے یا نہیں؟"

"بکاؤ ہے جی اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں۔"

"تو بتلاتے کیوں نہیں۔ کے پیسے کا دو گے"؟

چھ پیسے لگے گا۔

حامد کا دل بیٹھ گیا کلیجہ مضبوط کر کے بولا' تین پیسے لو گے"؟ اور آگے بڑھا کہ دکاندار کی گھڑکیاں نہ سنے۔ مگر دکاندار نے گھڑکیاں نہ دیں۔ دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا اور پیسے لے لیے۔

حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا' گویا بندوق ہے اور شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔

محسن نے ہنستے ہوئے کہا "یہ دست پنا لایا ہے احمق اسے کیا کرو گے"؟

حامد نے دست پنا کو زمین پر پٹک کر کہا "ذرا اپنا بھشتی زمین پر گرا دو ساری پسلیاں چور چور ہو جائیں گی بچو کی۔"

محمود "تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے؟"

حامد "کھلونا کیوں نہیں ہے ابھی کندھے پر رکھا بندوق ہو گیا" ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا چاہوں تو اس تمھاری ناک پکڑ لوں ایک چمٹا دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے تمھارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ۔"

سمیع متاثر ہو کر بولا "میری خنجری سے بدلو گے دو آنے کی ہے۔"

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا "میرا دست پناہ چاہے تو تمھاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے۔ بس ایک چمڑے کی جھلی لگا دی ڈھب ڈھب بولنے لگی ذرا سا پانی لگے تو ختم ہو جائے۔ میرا بہادر دست پناہ تو آگ میں پانی میں آندھی میں طوفان میں برابر ڈٹا رہے گا۔ میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اب دست پناہ نہیں مل سکتا۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے' حامد ہے بڑا ہوشیار اب دو فریق ہو گئے محمود' محسن' اور نوری ایک طرف حامد یکہ و تنہا دوسری طرف سمیع غیر جانبدار ہے جس کی فتح دیکھے گا اس کی طرف ہو جائے گا۔ مناظرہ شروع ہو گیا۔ آج حامد کی زبان بڑی صفائی سے چل رہی ہے۔ اتحاد ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے پریشان ہو رہا ہے۔ ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے حامد کے پاس حق اور اخلاق' ایک طرف مٹی ربڑ اور لکڑی کی چیزیں دوسری جانب اکیلا لوہا جو اس وقت اپنے آپ کو فولاد کہہ رہا ہے۔ وہ ۔۔ئیں تن ہے صف شکن ہے اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آ جائے تو میاں بھشتی کی اوسان خطا ہو جائے۔ میاں سپاہی مشکی بندوق چھوڑ کر بھاگیں۔ وکیل صاحب کا سارا قانون پیٹ میں سما جائے۔ چغے منہ میں چھپا کر لیٹ جائیں۔ مگر بہادر یہ رستم ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائے گا اور اس کی آنکھیں نکال لے گا۔

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا " اچھا تمھار دست پناہ پانی تو نہیں بھر سکتا حامد نے دست پناہ کو سیدھا کر کے کہا کہ یہ بھشتی کو ایک ڈانٹ پلائے گا تو دوڑا ہو پانی لا کر اس کے دروازے پر چھڑکنے لگے گا۔ جناب اس سے چاہے گھڑے مٹکے اور کونڈے بھر لو۔

محسن کا ناطقہ بند ہو گیا نوری نے کمک پہنچائی "بچہ گرفتار ہو جائیں تو عدالت میں بندھے بندھے پھریں گے تب تو ہمارے وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے بولیے جناب۔"

حامد کے پاس اس وار کا دفیعہ اتنا آسان نہ تھا دفعتا" اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادے سے پوچھا "اسے پکڑنے کون آئے گا۔"؟

محمود نے کہا "یہ سپاہی بندوق والا۔"

حامد نے منھ چڑا کر کہا یہ بے چارے اس رستم ہند کو پکڑ لیں گے۔؟ اچھا لاؤ ابھی ذرا مقابلہ ہو جائے اس کی صورت دیکھتے ہی بچہ کی ماں مرجائے گی پکڑیں گے کیا بے چارے "

محسن نے تازہ دم ہو کر وار کیا۔" تمھارے دست پناہ کا منھ روز آگ میں جلا کرے گا۔"

حامد کے پاس جواب تیار تھا۔ "آگ میں بہادر کودتے ہیں جناب تمھارے یہ وکیل اور سپاہی اور بھشتی ڈرپوک ہیں سب گھر میں گھس جائیں گے آگ میں کودنا وہ کام ہے۔ جو رستم ہی کر سکتا ہے۔"

نوری نے انتہائی جدت سے کام لیا " تمھارا دست پناہ باورچی خانہ میں زمین پر پڑا رہے گا۔ میرا وکیل شان سے میز کرسی لگا کر بیٹھے گا۔ اس جملہ نے مردوں میں بھی جان ڈال دی سمیع بھی جیت گیا۔" بے شک بڑے معرکے کی بات کہی "دست پناہ باورچی خانہ میں پڑا رہے گا۔

حامد نے دھاندلی کی میرا دست پناہ باورچی خانہ میں رہے گا وکیل صاحب کرسی پر

بیٹھیں گے تو جا کر انھیں زمین پر پٹک دے گا اور سارا قانون ان کے پیٹ میں ڈال دے گا۔"

اس جواب میں بالکل جان نہ تھی بالکل بے تکی سی بات تھی لیکن قانون پیٹ میں ڈالنے والی بات چھا گئی تینوں سورما منھ تکتے رہ گئے حامد نے میدان جیت لیا، گو ثلاثہ کے پاس ابھی گیند سیٹی اور بت ریزروتھے مگر ان مشین گنوں کے سامنے ان بزدلوں کو کون پوچھتا ہے دست پناہ رستم ہند ہے اس میں کسی کو چوں و چرا کی گنجائش نہیں۔"

فاتح کو مفتوحوں سے تھا اور خوشامد کا مزاج ملتا ہے وہ حامد کو ملنے لگا اور سب نے تین تین آنے خرچ کیے اور کوئی کام کی چیز نہ لے سکے حامد نے تین ہی پیسوں میں رنگ جما لیا کھلونوں کا کیا اعتبار دو ایک دن میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ حامد کا دست پناہ تو فاتح رہے گا۔ ہمیشہ صلح کی شرطیں طے ہونے لگیں۔

محسن نے کہا "ذرا اپنا چمٹا دو ہم بھی دیکھیں تم چاہو تو ہمارا وکیل دیکھ لو حامد ہمیں اس مین کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ فیاض طبع فاتح ہے دست پناہ باری باری سے محمود، محسن، نور اور سمیع سب کے ہاتھوں میں گیا اور ان کے کھلونے باری باری حامد کے ہاتھ میں آئے کتنے خوبصورت کھلونے ہیں معلوم ہوتا ہے بولا ہی چاہتے ہیں مگر ان کھلونوں کے لئے انھیں دعا کون دے گا؟ کون کون ان کھلونوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا جتنا اماں جان دست پناہ کو دیکھ کر ہوں گی۔ اسے اپنے طرز عمل پر مطلق پچھتاوا نہیں ہے پھر اب تو دست پناہ تو ہے اور سب کا بادشاہ راستے میں محمود نے ایک پیسے کی ککڑیاں لیں۔ اس میں حامد کو بھی خراج ملا حالانکہ وہ انکار کرتا رہا۔ محسن اور سمیع نے ایک ایک پیسے کے فالسے لیے حامد کو خراج ملا یہ سب رستم ہند کی برکت تھی۔

گیارہ بجے سارے گاؤں میں چہل پہل ہو گئی میلے والے آگئے۔ محسن کی چھوٹی بہن نے دوڑ کر بہشتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور مارے خوشی جو اچھلی تو میاں

بھشتی نیچے آ رہے۔ اور عالم جاودانی کو سدھارے اس پر بھائی بہن میں مار پیٹ ہوئی۔ دونوں خوب روئے ان کی اماں جان یہ کہرام سن کر اور بگڑیں دونوں کو اوپر سے دو دو چانٹے رسید کیے۔ میاں نوری کے وکیل صاحب کا حشر اس سے بھی بدتر ہوا۔ وکیل زمین پر یا طاق پر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کی پوزیشن کا لحاظ تو کرنا ہی ہوگا دیوار میں دو کھونٹیاں گاڑی گئیں ان پر چیڑ کا ایک پرانا پڑا رکھا گیا پڑے پر سرخ رنگ کا ایک چیتھڑا بچھا دیا گیا جو منزلہ قالین کا تھا وکیل صاحب عالم بالا پہ جلوہ افروز ہوئے یہیں سے قانونی بحث کریں گے نوری ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا۔ معلوم نہیں پنکھے کی ہوا سے یا پنکھے کی چوت سے وکیل صاحب عالم بالا سے دنیائے فانی میں آ رہے اور ان کی مجسمہ خاکی کے پرزے ہوئے۔ پھر بڑے زور کا ماتم ہوا اور وکیل صاحب کی میت پارسی دستور کے مطابق کوڑے پر پھینک دی گئی۔ تاکہ بے کار نہ جا کر زاغ و زغن کے کام آ جائے۔

اب رہے میاں محمود کے سپاہی محترم اور ذی رعب ہستی ہے اپنے پیروں چلنے کی ذلت اسے گوارا نہیں۔ محمود نے اپنی بکری کا بچہ پکڑا اور اس پر سپاہی کو سوار کیا محمود کی بہن ایک ہاتھ سے سپاہی کو پکڑے ہوئے تھی اور محمود بکری کے بچہ کا کان پکڑ کر اسے دروازے پر چلا رہا تھا۔ اور اس کے دونوں بھائی سپاہی کی طرف سے تھونے والے داگتے لہو۔" پکارتے چلتے تھے معلوم نہیں کیا ہوا میاں سپاہی اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑے اور اپنی بندوق لیے زمین پر آ رہے۔ ایک ٹانگ مضروب ہو گئی۔ مگر کوئی مضائقہ نہیں، محمود ہوشیار ڈاکٹر ہے ڈاکٹر نگم اور بھاٹیہ اس کی شاگردی کر سکتے ہیں اور یہ ٹوٹی ٹانگ آنا" فانا" میں جوڑ دے گا صرف گولر کا دودھ چاہیے گولر کا دودھ آتا ہے ٹانگ جوڑی جاتی ہے لیکن جوں ہی کھڑا ہوتا ہے ٹانگ پھر الگ ہو جاتی ہے۔ عملی جراحی ناکام ہو جاتی ہے تب محمود اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا ہے۔ اب وہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ ایک ٹانگ سے تو نہ چل سکتا تھا۔ نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اب وہ گوشہ میں بیٹھ کر ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔

اب میاں حامد کا قصہ سنیے۔ امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی اور اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگی۔ دفعتاً" اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر چونک پڑی۔

"یہ دست پناہ کہاں تھا بیٹا"؟

"میں نے مول لیا ہے تین پیسے میں۔"

امینہ نے چھاتی پیٹ لی۔ "یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہو گئی نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ لایا کیا یہ دست پناہ۔ سارے میلے میں تجھے اور کوئی چیز نہ ملی۔"

حامد نے خطا وارانہ انداز سے کہا۔ " تمھاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں۔"

امینہ کا غصہ فوراً" شفقت میں تبدیل ہو گیا۔ اور شفقت بھی وہ نہیں جو منہ پر بیان ہوتی ہے۔ اور اپنی ساری تاثیر لفظوں میں منتشر کر دیتی ہے۔ یہ بے زبان شفقت تھی۔ درد التجا میں ڈوبی ہوئی اف کتنی نفس کشی ہے۔ کتنی جانسوزی ہے۔ غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لیے کتنا ضبط کیا۔ جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے اس کا دل کتنا لہراتا ہو گا۔ اتنا ضبط اس سے ہوا۔ کیونکہ اپنی بوڑھی ماں کی یاد اسے وہاں بھی رہی۔ میرا لال میری کتنی فکر رکھتا ہے اس کے دل میں ایک ایسا جزبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آ جائے اور وہ اسے حامد کے اوپر نثار کر دے۔

اور تب بڑی دلچسپ بات ہوئی بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی وہ رونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا اور نہ شاید ہمارے بعض ناظرین ہی سمجھ سکیں گے۔

زیور کا ڈبہ

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد چندر پرکاش کو ایک ٹیوشن کرنے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ ان کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ اسی سال والد بھی چل بسے' اور پرکاش زندگی کے جو شیریں خواب دیکھا کرتا تھا' وہ مٹی میں مل گئے والد اعلیٰ عہدے پر تھے۔ ان کی وساطت سے چندر پرکاش کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی پوری امید تھی۔ مگر وہ سب منصوبے دھرے ہی رہ گئے۔ اور اب گزر اوقات کے لئے صرف تیس روپے ماہوار کی ٹیوشن ہی رہ گئی ہے۔ والد نے کوئی جائیداد نہ چھوڑی الٹا بھوک کا بوجھ اور سر پر لاد دیا۔ اور بیوی بھی ملی تو تعلیم یافتہ' شوقین' زبان کی طرارہ جسے موٹا کھانے اور موٹا پہننے کی نسبت مر جانا قبول تھا۔ چندر پرکاش کو تیس کی نوکری کرتے شرم آتی تھی۔ لیکن ٹھاکر صاحب نے رہنے کے لئے مکان دے کر ان کے آنسو پونچھ دئے۔ یہ مکان ٹھاکر صاحب کے مکان سے ملا ہوا تھا' پختہ ہوادار صاف ستھرا۔ اور ضروری سامان سے

آراستہ' ایسا مکان بیس روپے ماہوار سے کم میں نہ مل سکتا تھا۔ کام صرف دو گھنٹے کا تھا۔ لڑکا تو لگ بھگ انہیں کی عمر کا تھا۔ مگر بڑا کند ذہن' کام چور' ابھی نویں درجہ میں پڑھتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ٹھاکر اور ٹھکرائن دونوں پرکاش کی بڑی عزت کرتے تھے' بلکہ اپنا ہی لڑکا سمجھتے تھے۔ گویا ملازم نہیں' گھر کا آدمی تھا' اور گھر کے ہر ایک معاملہ میں اس سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

شام کا وقت تھا' پرکاش نے اپنے شاگرد ویرندر کو پڑھا کر چلنے کے لئے چھڑی اٹھائی تو ٹھکرائن نے کہا۔ "ابھی نہ جاؤ بیٹا' ذرا میرے ساتھ آؤ' تم سے کچھ کہنا ہے۔"

پرکاش نے دل میں سوچا' وہ کیا بات ہے جو ویرندر کے سامنے نہیں کہی جا سکتی پرکاش کو علیحدہ لے جا کر امادیوی نے کہا' "تمہاری کیا صلاح ہے؟ ویرو کا بیاہ کر دوں ایک بہت اچھے گھر کا پیغام آیا ہے۔

پرکاش نے مسکرا کر کہا "یہ تو ویرو بابو ہی سے پوچھئے۔"

"نہیں میں تم سے پوچھتی ہوں۔"

پرکاش نے ذرا تذبذب سے کہا۔ "میں اس معاملہ میں کیا صلاح دے سکتا ہوں؟ ان کا بیسواں سال تو ہے۔ لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ بیاہ کے بعد پڑھنا ہو چکا۔"

"تو ابھی نہ کروں' تمہاری یہی صلاح ہے۔"

"جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں' میں نے تو دونوں باتیں عرض کر دیں۔"

"تو کر ڈالوں؟ مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ لڑکا کہیں بہک نہ جائے پھر پچھتانا پڑے گا۔"

"میرے رہتے ہوئے تو آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہاں مرضی ہو تو کر ڈالئے کوئی حرج بھی نہیں ہے۔"

"سب تیاریاں تمہیں کرنی پڑیں گی یہ سمجھ لو۔"

"تو میں کب انکار کرتا ہوں۔"

روٹی کی خیر منانے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک کمزوری ہوتی ہے۔ جو انہیں تلخ سچائی کے اظہار سے روکتی ہے۔ پرکاش میں بھی یہی کمزوری تھی۔

بات پکی ہو گئی اور شادی کا سامان ہونے لگا۔ ٹھاکر صاحب ان اصحاب میں سے تھے جنہیں اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہ میں پرکاش کی ڈگری اپنے ساٹھ سالہ تجربے سے زیادہ قیمتی تھی۔ شادی کا سارا انتظام پرکاش کے ہاتھوں میں تھا' دس بارہ ہزار روپیہ خرچ کرنے کا اختیار کچھ تھوڑی عزت کی بات نہیں تھی' دیکھتے دیکھتے ایک خستہ حال نوجوان ذمہ دار مینجر بن بیٹھا۔ کہیں بزاز اسے سلام کرنے آیا ہے۔ کہیں محلّہ کا بنیا گھیرے ہوئے ہے۔ کہیں گیس اور شامیانے والا خوشامد کر رہا ہے۔ وہ چاہتا تو دو چار سو روپے آسانی سے اڑا سکتا تھا' لیکن اتنا کمینہ نہ تھا۔ پھر اس کے ساتھ کیا دغا کرے جس نے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیا ہو۔ مگر جس دن اس نے پانچ ہزار کے زیورات خریدے اس کے کلیجہ پر سانپ لوٹنے لگا۔

گھر آکر چمپا سے بولا' "ہم تو یہاں روٹیوں کے محتاج ہیں' اور دنیا میں ایسے ایسے آدمی پڑے ہیں جو ہزاروں لاکھوں روپے کے زیورات بنوا ڈالتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب نے آج بہو کے چڑھاوے کے لئے پانچ ہزار کے زیور خریدے۔ ایسی ایسی چیزوں کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں سچ کہتا ہوں' بعض چیزوں پر تو آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔

چمپا حاسدانہ لہجے میں بولی "اونہہ ہمیں کیا کرنا ہے' جنہیں ایشور نے دیا ہے وہ پہنیں یہاں تو رو رو کر مرنے کو پیدا ہوئے ہیں۔"

چندر پرکاش "یہی لوگ مزے اڑاتے ہیں' نہ کمانا نہ دھمانا باپ دادا چھوڑ گئے ہیں۔ مزے سے کھاتے اور چین کرتے ہیں۔ اسی لئے کہتا ہوں' ایشور بڑا غیر منصف ہے۔"

چمپا' "اپنا اپنا مقدر ہے۔ ایشور کا کیا قصور ہے۔ تمہارے باپ دادا چھوڑ گئے ہوتے تو تم بھی مزے اڑاتے۔ یہاں تو روز مرہ کا خرچ چلانا مشکل ہے' گہنے کپڑے

کون روئے؟ کوئی ڈھنگ کی ساڑی بھی نہیں کہ کسی بھلے آدمی کے گھر جانا ہو تو پہن لوں۔ میں تو اسی سوچ میں ہوں کہ ٹھکرائن کے یہاں شادی میں کیسے جاؤں گی۔ سوچتی ہوں بیمار پڑ جاتی تو جان بچتی۔"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پرکاش نے تسلی دی' "ساڑی تمہارے لئے ضرور لاؤں گا' یہ مصیبت کے دن ہمیشہ نہ رہیں گے۔ زندہ رہا تو ایک دن تم سر سے پاؤں تک زیور سے لدی ہو گی۔"

چمپا مسکرا کر بولی' "چلو ایسی من کی مٹھائی میں نہیں کھاتی' گزر ہوتی جائے۔ یہی بہت ہے۔"

پرکاش نے چمپا کی بات سن کر شرم اور حیا سے سر جھکا لیا۔ چمپا اسے اتنا کاہل الوجود سمجھتی ہے۔

رات کو دونوں کھانا کھا کر سوئے تو پرکاش نے پھر زیوروں کا ذکر چھیڑا زیور اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے' "اس شہر میں ایسے بڑھیا زیور بنتے ہیں۔ مجھے اس کی امید نہ تھی۔"

چمپا نے کہا' "کوئی اور بات کرو' زیوروں کی بات سن کر دل جلتا ہے۔"

"ایسی چیزیں تم پہنو تو رانی معلوم ہونے لگو۔"

"زیوروں سے کیا خوبصورتی معلوم ہوتی ہے' میں نے تو ایسی بہت سی عورتیں دیکھی ہیں' جو زیور پہن کر بھی بھدی معلوم ہوتی ہے۔"

ٹھاکر صاحب ـــــ مطلب کے یار معلوم ہوتے ہیں' یہ نہ ہوا کہ کہتے'

"تم اس میں سے کوئی چمپا کے لئے لیتے جاؤ۔"

"تم کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔"

"اس میں بچپن کی کیا بات ہے کوئی فراخ دل آدمی کبھی اتنی کنجوسی نہ کرتا۔"

"میں نے سخی کوئی نہیں دیکھا' جو اپنی بہو کے زیور کسی غیر کو بخش دے۔"

"میں غیر نہیں ہوں' ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں' میں ان کے لڑکے کو پڑھاتا ہوں اور شادی کا سارا انتظام کر رہا ہوں' اگر سو دو سو کی چیز دے دیتے تو کون سی بڑی بات تھی۔ مگر اہلِ ثروت کا دل دولت کے بوجھ سے دب کر سکڑ جاتا ہے۔ اس میں سخاوت اور فراخ حوصلگی کے لئے جگہ ہی نہیں رہتی۔"

یکایک پرکاش چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ آہ چمپا کے نازک جسم پر ایک گہنا بھی نہیں پھر بھی وہ کتنی شاکر ہے۔ اسے چمپا پر رحم آگیا۔ یہی تو کھانے پینے کی عمر ہے اور اس عمر میں اس بچاری کو ہر ایک چیز کے لئے ترسنا پڑتا ہے۔ وہ دبے پاؤں گھر سے باہر چھت پر آیا۔ ٹھاکر صاحب کی چھت اس چھت سے ملی ہوئی تھی۔ بیچ میں ایک پانچ فٹ اونچی دیوار تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ گیا اور ٹھاکر صاحب کی چھت پر آہستہ سے اتر گیا' گھر میں بالکل سناٹا تھا۔

اس نے سوچا پہلے زینہ سے اتر کر کمرہ میں چلوں' اگر وہ جاگ گئے تو زور سے ہنس دوں گا اور کہوں گا' کیا چرکا دیا۔ کہہ دوں گا۔ میرے گھر کی چھت سے کوئی آدمی ادھر آتا دکھائی دیا اس لئے میں بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا کہ دیکھوں یہ کیا کر رہا ہے؟ کسی کا مجھ پر شک ہی نہیں ہو گا۔ اگر صندوق کی کنجی مل گئی تو پو بارہ ہیں۔ سب نوکروں پر شبہ کریں گے۔ میں بھی کہوں گا صاحب نوکروں کی حرکت ہے ان کے سوا اور کون لے جا سکتا ہے' میں نکوہ نکل جاؤں گا۔ شادی کے بعد کوئی دوسرا گھر لے لوں گا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک ایک زیور چمپا کو دوں گا جس سے کوئی شک نہ گزرے۔

پھر بھی وہ جب زینہ سے اترنے لگا تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

دھوپ نکل آئی تھی پرکاش ابھی سو رہا تھا کہ چمپا نے اسے جگا کر کہا۔ "بڑا غضب ہو گیا رات کو ٹھاکر صاحب کے گھر میں چوری ہو گئی۔ چور زیوروں کا ڈبہ اٹھا کر لے گئے۔"

پرکاش نے بڑے پڑے پوچھا کسی نے پکڑا نہیں چور کو۔"

"کسی کو خبر بھی نہیں' وہی ڈبے لے گئے جس میں شادی کے زیور رکھے تھے نہ جانے کیسے چابی اڑا لی۔ اور انہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس صندوق میں ڈبہ رکھا ہے۔"

"نوکروں کی کارستانی ہو گی' باہر کے آدمی کا یہ کام نہیں ہے۔"

"نوکر تو ان کے تینوں پرانے ہیں۔"

نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے' آج موقع دیکھا اڑا لے گئے۔"

"تم جا کر ان کو تسلی دو ٹھکرائن بے چاری رو رہی تھی۔ تمہارا نام لے کر کہتی تھیں کہ بیچارا مہینوں ان زیوروں کے لئے دوڑا۔ ایک ایک چیز اپنے سامنے بنوائی اور چور مونڈی کاٹے نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔"

پرکاش جھٹ پٹ اٹھ بیٹھا اور گھبرایا ہوا سا جا کر ٹھکرائن سے بولا' "یہ تو بڑا غضب ہو گیا ماتا جی' مجھے تو ابھی ابھی چمپا نے بتایا۔"

ٹھاکر صاحب سر پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے تھے' بولے کہیں سیندھ نہیں کوئی تالا نہیں ٹوٹا' کسی دوازے کی چول نہیں اتری سمجھ میں نہیں آیا کہ چور کدھر سے آیا؟"

ٹھکرائن نے رو کر کہا۔ "میں تو لٹ گئی بھیا بیاہ سر پر ہے' کیا ہو گا' بھگوان تم نے کتنی دوڑ دھوپ کی تھی' تب کہیں جا کر چیزیں تیار ہو کر آئی تھیں نہ جانے کس منحوس ساعت میں بنوائی تھیں۔"

پرکاش نے ٹھاکر صاحب کے کان میں کہا' "مجھے تو نوکروں کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔"

ٹھکرائن نے مخالفت کی' "ارے نہیں بھیا۔ نوکروں میں کوئی نہیں۔ دس ہزار روپے یونہی اوپر رکھے رہتے ہیں۔ کبھی ایک پائی کا نقصان نہیں ہوا۔"

ٹھاکر صاحب نے ناک سکوڑ کر کہا۔ "تم کیا جانو آدمی کا دل کتنی جلدی بدل جاتا ہے۔ جس نے ابھی تک چوری نہیں کی وہ چوری نہیں کرے گا۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ میں پولیس میں رپورٹ کروں گا اور ایک ایک نوکر کی تلاشی کراؤں گا۔ کہیں مال اڑا دیا ہو گا۔ جب پولیس کے جوتے پڑیں گے تو آپ اقبال کریں گے۔"

پرکاش نے پولیس کا گھر میں آنا خطرناک سمجھا۔ کہیں ان کے گھر کی تلاشی لیں تو ستم ہی ہو جائے گا۔ بولے "پولیس میں رپورٹ کرنا اور تحقیقات کرنا بالکل بے فائدہ ہے۔"

ٹھاکر صاحب نے منہ بنا کر کہا' "تم بھی کیا بچوں کی سی بات کر رہے ہو پرکاش بابو۔ بھلا چوری کرنے والا خود بخود اقبال کرے گا۔ تم زدوکوب بھی نہیں کر سکتے' ہاں پولیس میں رپورٹ کرنا مجھے بھی فضول معلوم ہوتا ہے' مال چلا گیا' اب کیا ملے گا۔"

پرکاش "لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

ٹھاکر۔ "کوئی فائدہ نہیں' ہاں اگر کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ہو جو چپکے چپکے پتہ لگا دے تو البتہ مال نکل آئے۔ لیکن یہاں ایسے آدمی کہاں نصیبوں کو رو کر بیٹھ رہو اور کیا۔"

پرکاش' "آپ بیٹھ رہئے' لیکن میں بیٹھنے والا نہیں' میں انہیں نوکروں کے سامنے چور کا نام نکلواؤں گا۔"

ٹھکرائن "نوکروں پر مجھے پورا یقین ہے۔ کسی کا نام بھی نکل آئے تو مجھے یہی خیال رہے گا کہ یہ کسی باہر کے آدمی کا کام ہے۔ چاہے جدھر سے آیا ہو پر چور آیا باہر سے تمہارے کوٹھے سے بھی تو آ سکتا ہے۔"

ٹھاکر۔ "ہاں ذرا اپنے کوٹھے پر دیکھو شاید کچھ نشان ملے۔ کل دروازہ تو کھلا ہوا نہیں رہ گیا؟"

پرکاش کا دل دھڑکنے لگا' "بولا میں تو دس بجے دروازہ بند کر لیتا ہوں ہاں کوئی پہلے سے موقع پا کر کوٹھے پر چلا گیا ہو۔ وہاں چھپا بیٹھا رہا ہو تو دوسری بات ہے۔"

تینوں آدمی چھت پر گئے' تو بیچ کی منڈیر پر کسی کے پاؤں کے نشان دکھائی دئے جہاں پرکاش کا پاؤں پڑا تھا' وہاں کا چونہ لگ جانے سے چھت پر پاؤں کا نشان پڑ گیا تھا۔ پرکاش کی چھت پر جا کر منڈیر کی دوسری طرف دیکھا تو ویسے ہی نشان وہاں بھی دکھائی دئے۔ ٹھاکر صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ لحاظ کے مارے کچھ نہ کہہ سکے

تھے۔ پرکاش نے ان کے دل کی بات کھول دی' "اب تو کوئی شک ہی نہیں رہا۔"

ٹھاکر صاحب نے کہا' "ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ لیکن اتنا پتہ لگ جانے سے کیا مال تو جانا تھا' وہ گیا' اب چلو آرام سے بیٹھو' آج روپیہ کی کوئی تجویز کرنی ہو گی۔

پرکاش' "میں آج ہی یہ گھر چھوڑ دوں گا۔"

ٹھاکر' "کیوں ہمیں تمہارا ....."

پرکاش' "آپ نہ کہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں' میرے سر پر بہت بڑی جواب دہی آ گئی' میرا دروازہ نو دس بجے تک کھلا ہی رہتا ہے۔ چور نے راستہ دیکھ لیا ہے۔ ممکن ہے دو چار دن میں پھر آ گھسے۔ گھر میں اکیلی ایک عورت ہے سارے گھر کی نگرانی نہیں کر سکتی۔ ادھر وہ تو باورچی خانہ میں بیٹھی ہے ادھر کوئی چپکے سے اوپر چڑھ گیا تو ذرا بھی آہٹ نہیں مل سکتی۔ میں گھوم گھوم کر کبھی ۹ بجے آیا کبھی دس بجے اور شادی کے دنوں میں دیر ہوتی رہے گی۔ ادھر کا راستہ بند ہی ہو جانا چاہئے۔ میں تو سمجھتا ہوں چوری سارے میرے سر ہے۔"

ٹھکرائن ڈریں' "تم چلے جاؤ گے بھیا تب تو گھر اور پھاڑ کھائے گا۔"

پرکاش' "کچھ بھی ہو ماتا جی۔ مجھے بہت جلد گھر چھوڑ دینا پڑے گا۔ میری غفلت سے چوری ہو گئی۔ اس کا مجھے خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔"

پرکاش چلا گیا تو ٹھاکر کی عورت نے کہا۔ "بڑا لائق آدمی ہے چور ادھر سے آیا یہی بات اسے کھا گئی۔ کہیں یہ چور کو پکڑ پائے تو کچا ہی کھائے۔"

"مار ہی ڈالے"

"دیکھ لینا کبھی نہ کبھی مال برآمد کرے گا۔"

"اب اس گھر میں ہرگز نہ رہے گا۔ کتنا ہی سمجھاؤ۔"

"کرایہ کے بیس روپے دینے پڑیں گے۔"

"ہم کیوں کرایہ دیں' وہ آپ ہی گھر چھوڑ رہے ہیں' ہم تو کچھ کہتے نہیں۔"

"کرایہ تو دینا ہی پڑے گا' ایسے آدمی کے لئے کچھ غم بھی کھانا پڑے تو برا نہیں

لگتا۔"

"میں تو سمجھتی ہوں کرایہ لیں گے بھی نہیں۔"

"تیس روپے میں گزر بھی تو نہ ہو گی۔"

پرکاش نے اسی دن وہ گھر چھوڑ دیا۔ اس گھر میں رہنے میں خدشہ تھا' لیکن جب تک شادی کی دھوم دھام رہی' اکثر تمام دن یہیں رہتے تھے۔ پیش بندی کے لئے چمپا سے کہا ایک سیٹھ جی کے ہاں ۵۰ روپیہ ماہوار کا کام مل گیا ہے' مگر وہ روپیہ انہیں کے پاس جمع کرتا جاؤں گا' وہ آمدنی صرف زیوروں میں خرچ ہو گی اس میں سے ایک پیسہ گھر کے خرچ میں نہ آنے دوں گا۔" خاوند کی محبت کا یہ ثبوت پا کر اسے اپنی قسمت پر ناز ہوا دیوتاؤں پر اس کا اعتقاد اور بھی پختہ ہو گیا۔

اب تک پرکاش اور چمپا میں کوئی راز نہ تھا۔ پرکاش کے پاس جو کچھ تھا وہ چمپا کا تھا۔ چمپا ہی کے پاس اس کے ٹرنک' صندوق اور الماری کی چابیاں رہتی تھیں۔ مگر جب پرکاش کا ایک صندوق ہمیشہ بند رہتا تھا اس کی چابی کہاں؟ اس کا چمپا کو پتہ نہیں وہ پوچھتی ہے' اس صندوق میں کیا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں۔ "کچھ نہیں پرانی کتابیں ہیں ماری ماری پھرتی تھیں اٹھا کے صندوق میں بند کر دی ہیں۔" چمپا کو شک کی گنجائش نہ تھی۔

ایک دن چمپا انہیں پان دینے گئی' تو دیکھا وہ اس صندوق کو کھولے کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ فق ہو گیا۔ شبھے کا اکھوا سا نکلا مگر پانی بہہ کر سوکھ گیا۔ چمپا کسی ایسے راز کا خیال ہی نہ کر سکی جس سے شبھے کو غذا ملتی۔

لیکن پانچ ہزار کی پونجی کو اس طرح چھوڑ دینا کہ اس کا دھیان ہی نہ آئے' پرکاش کے لئے ناممکن تھا۔ وہ کہیں باہر جاتا تو ایک بار صندوق کو ضرور کھولتا۔

ایک دن پڑوس میں چوری ہو گئی۔ اس دن سے پرکاش کمرہ ہی میں سونے لگا۔ جون کا مہینہ تھا۔ گرمی کے مارے دم گھٹتا تھا۔ چمپا نے باہر سونے کے لئے کہا مگر

پرکاش نہ مانا' اکیلا گھر کیسے چھوڑ دے۔

چمپا نے کہا۔ "چوری ایسوں کے گھر نہیں ہوتی۔ چور کچھ دیکھ کر ہی جان خطرہ میں ڈالتے ہیں۔ یہاں کیا رکھا ہے۔"

پرکاش نے غصہ سے کہا "کچھ نہیں' برتن تو ہیں' غریب کے لئے تو اپنی ہنڈیا ہی بہت ہے۔"

ایک دن چمپا نے کمرہ میں جھاڑو لگائی تو صندوق کھسکا کر ایک طرف رکھ دیا۔ پرکاش نے صندوق کی جگہ بدلی ہوئی دیکھی تو بولا' "صندوق تم نے ہٹایا تھا؟"

یہ پوچھنے کی بات نہ تھی' جھاڑو لگاتے وقت اکثر چیزیں ادھر ادھر کھسکا دی جاتی ہیں۔ بولی "میں کیوں ہٹانے لگی۔"

"پھر کسی نے ہٹایا۔"

"گھر میں تم رہتی ہو جانے کون۔"

"اچھا اگر میں نے ہی ہٹا دیا تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔"

"کچھ یوں ہی پوچھا تھا۔"

مگر جب تک صندوق کھول کر تمام چیزیں دیکھ نہ لے پرکاش کو چین کہاں۔ چمپا جیسے ہی کھانا پکانے لگی۔ وہ صندوق کھول کر دیکھنے لگا۔ آج چمپا نے پکوڑیاں بنائی تھیں' پکوڑیاں گرم گرم ہی مزہ دیتی ہیں۔ پرکاش کو پکوڑیاں پسند بہت تھیں۔ اس نے تھوڑی سی پکوڑیاں طشتری میں رکھیں اور پرکاش کو دینے گئی۔ پرکاش نے اسے دیکھتے ہی صندوق دھماکے سے بند کر دیا اور تالا لگا کر اسے بہلانے کے لئے بولا' "طشتری میں کیا لائیں' آج نہ جانے کیوں مطلق بھوک نہیں لگی۔ پیٹ میں گرانی معلوم ہوتی ہے۔"

"اچھا پکوڑیاں ہیں۔"

آج چمپا کے دل میں شبہ کا وہ اکھواہ جیسے ہرا ہو کر لہلہا اٹھا۔ صندوق میں کیا ہے؟ یہ دیکھنے کے لئے اس کا دل بے قرار ہو گیا۔ پرکاش اس کی چابی چھپا کر رکھتا

تھا۔ چمپا کو وہ چابی کسی طرح نہ ملی۔ ایک دن ایک پھیری والا بساطی پرانی چابیاں بیچنے آ نکلا۔ چمپا نے اس تالے کی چابی خرید لی اور صندوق کھول ڈالا' ارے یہ تو زیور ہیں۔ اس نے ایک ایک زیور نکال کر دیکھا۔ یہ کہاں سے آئے۔ مجھ سے تو کبھی ان کے متعلق بات چیت نہیں کی۔ معاً" اس کے دل میں خیال گزرا یہ زیورات ٹھاکر صاحب کے تو نہیں' چیزیں وہی تھیں جن کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ اسے اب کوئی شک نہ رہا۔ لیکن اتنی بڑی شرم و ندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ اس نے ایک دم صندوق بند کر دیا اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ ان کی اتنی ہمت کیسے پڑی؟ یہ کمینہ خواہش ان کے من میں آئی کیسے؟ میں نے تو کبھی زیوروں کے لئے انہیں تنگ نہیں کیا۔ اگر تنگ بھی کرتی تو کیا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ چوری کر کے لائیں۔ چوری زیوروں کے لئے۔ ان کا ضمیر اتنا کمزور کیوں ہو گیا؟

اس دن سے چمپا کچھ اداس رہنے لگی۔ پرکاش سے وہ محبت نہ رہی' نہ وہ عزت کا جذبہ' بات بات پر تکرار ہو جاتی۔ پہلے دونوں ایک دوسرے سے دل کی باتیں کہتے تھے۔ مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے۔ آپس میں ہمدردی تھی۔ مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں ایک بات بھی نہ ہوتی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ شہر کے ایک بنک میں اسسٹنٹ مینجر کی جگہ خالی ہوئی۔ پرکاش نے اکاؤنٹنٹ کا امتحان پاس کیا ہوا تھا' لیکن شرط یہ تھی کہ نقد دس ہزار روپیہ کی ضمانت داخل کی جائے۔ اتنی رقم کہاں سے آئے' پرکاش تڑپ تڑپ کر رہ جاتا۔

ایک دن ٹھاکر صاحب سے اس معاملہ پر بات چیت چل پڑی۔ ٹھاکر صاحب نے کہا "تم کیوں نہیں درخواست بھیجتے؟"

پرکاش نے سر جھکا کر کہا' "دس ہزار کی نقد ضمانت مانگتے ہیں۔ میرے پاس روپے کہاں رکھے ہیں۔"

اجی درخواست تو دو' اگر اور سب امور طے ہو جائیں تو ضمانت بھی دے دی

جائے گی۔ اس کی فکر نہ کرو۔"

پرکاش نے حیران ہو کر کہا' آپ زر ضمانت داخل کر دیں گے؟"

"ہاں ہاں یہ کونسی بڑی بات ہے۔"

پرکاش گھر کی طرف چلا تو بڑا اداس تھا۔ اس کو یہ نوکری ضرور ملے گی' مگر پھر بھی خوش نہیں ہے۔ ٹھاکر صاحب کی صاف دلی اور ان کے اس پر اتنے زبردست اعتماد سے اسے دلی صدمہ ہو رہا ہے۔ ان کی شرافت اس کے کمینہ پن کو روندے ڈالتی ہے۔

اس نے گھر آکر چمپا کو خوشخبری سنائی۔ چمپا نے سن کر منہ پھیر لیا' پھر ایک منٹ بعد بولی' اٹھا کر صاحب سے تم نے کیوں ضمانت دلوائی؟ جگہ نہ ملتی نہ سہی روٹیاں تو مل ہی جاتی ہیں۔ روپے پیسے کا معاملہ ہے' کہیں بھول چوک ہو جائے تو تمہارے ساتھ ان کے پیسے بھی جائیں۔"

"یہ تم کیسے سمجھتی ہو کہ بھول چوک ہو گی' کیا میں ایسا اناڑی ہوں؟"

چمپا نے کہا' "آدمی کی نیت بھی تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔"

پرکاش سناٹے میں آگیا۔ اس نے چمپا کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ مگر چمپا نے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ اس کے اندرونی سیال کا اندازہ نہ لگا سکا' مگر ایسی خوشخبری سن کر بھی چمپا کا اداس رہنا کھٹکنے لگا۔ اس کے دل میں سوال پیدا ہوا' اس کے الفاظ میں کہیں طنز تو نہیں چھپا ہے۔ چمپا نے صندوق کھول کر کہیں دیکھ تو نہیں لیا اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے وہ اس وقت اپنی ایک آنکھ بھی نذر کر سکتا تھا۔

کھانے کے وقت پرکاش نے چمپا سے پوچھا' "تم نے کیا سوچ کر کہا کہ آدمی کی نیت تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی؟" جیسے اس کی زندگی اور موت کا سوال ہو۔

چمپا نے آزردہ ہو کر کہا' "کچھ نہیں میں نے دنیا کی بات کہی تھی۔"

پرکاش کو تسلی نہ ہوئی' اس نے پوچھا۔

"کیا جتنے آدمی بنک میں ملازم ہیں' ان کی نیت بدلتی رہتی ہے۔"

چمپا نے گلا چھڑانا چاہا' "تم تو زبان پکڑتے ہو' ٹھاکر صاحب کے ہاں شادی میں ہی تو تم اپنی نیت ٹھیک نہ رکھ سکے' سو دو سو روپیہ کی چیز گھر میں رکھ ہی لی۔"

پرکاش کے دل سے بوجھ سا اتر گیا۔ مسکرا کر بولا' "اچھا تمہارا اشارہ اس طرف تھا۔ لیکن میں نے کمیشن کے سوائے ان کی ایک پائی بھی نہیں چھوئی۔ اور کمیشن لینا تو کوئی پاپ نہیں۔ بڑے بڑے حکام کھلے خزانے کمیشن لیا کرتے ہیں۔"

چمپا نے نفرت کے لہجہ میں کہا "جو آدمی اپنے اوپر اتنا یقین رکھے' اس کی آنکھ بچا کر ایک پائی بھی لینا گناہ سمجھتی ہوں۔ تمہاری شرافت جب جانتی کہ تم کمیشن کے روپے جا کر ان کے حوالے کر دیتے۔ ان چھ مہینوں میں انہوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا سلوک کئے۔ کچھ دیا ہی ہے؟ مکان تم نے خود چھوڑا لیکن وہ بیس روپے ماہوار دئے جاتے ہیں۔ علاقے سے کوئی سوغات آتی ہے' تمہارے ہاں ضرور بھیجتے ہیں۔ تمہارے پاس گھڑی نہ تھی۔ اپنی گھڑی تمہیں دے دی۔ تمہاری کہارن جب ناغہ کرتی ہے خبر پاتے ہی اپنا نوکر بھیج دیتے ہیں۔ میری بیماری میں ڈاکٹر کی فیس انہوں نے ادا کی اور دن میں دو دو دفعہ پوچھنے آیا کرتے تھے۔ یہ ضمانت کی کیا چھوٹی بات ہے اپنے رشتہ داروں تک کی ضمانت تو جلدی سے کوئی دیتا ہی نہیں۔ تمہاری ضمانت کے لئے نقد دس ہزار روپے نکال کر دے دئے۔ اسے تم چھوٹی بات سمجھتے ہو۔ آج تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو ان کے روپے تو ضبط ہو جائیں۔ جو آدمی اپنے اوپر اتنی مہربانی کرے اس کے لئے ہمیں جان قربان کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہنا چاہئے۔"

پرکاش کھا کر لیٹا تو اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ دکھتے ہوئے پھوڑے میں کتنا مواد بھرا ہے' یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے جب نشتر لگایا جاتا ہے۔ دل کی سیاہی اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کوئی اسے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔ کوئی سوشل یا پولیٹکل کارٹون دیکھ کر کیوں ہمارے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اس لئے کہ وہ تصویر ہماری حیوانیت کو کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے۔ وہ جو دل کے اتھاہ سمندر میں بکھرا ہوا پڑا تھا۔ اکٹھا ہو کر گھر سے نکلنے والے کوڑے کی طرح اپنی

جسامت سے ہمیں متوحش کر دیتا ہے۔ تب ہمارے منہ سے نکل پڑتا ہے کہ افسوس چمپا کے ان ملامت آمیز الفاظ نے پرکاش کی انسانیت کو بیدار کر دیا۔ وہ صندوق کئی گنا بھاری ہو کر پتھر کی طرح اسے دبانے لگا۔ دل میں پھیلی ہوئی حرارتیں ایک نقطہ پر جمع ہو کر شعلہ گیر ہو گئیں۔

کئی روز گزر گئے۔ پرکاش کو بنک میں ملازمت مل گئی۔ اس تقریب میں اس کے ہاں مہمانوں کی دعوت ہے۔ ٹھاکر صاحب' ان کی اہلیہ ویرندر اور اس کی نئی دلہن بھی آئے ہوئے ہیں باہر یار دوست گا بجا رہے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد ٹھاکر صاحب چلنے کو تیار ہوئے۔

پرکاش نے کہا۔ "آج آپ کو یہاں رہنا ہو گا۔ دادا میں اس وقت نہ جانے دوں گا۔"

چمپا کو اس کی یہ ضد بری معلوم ہوئی۔ چارپائیاں نہیں ہیں۔ بچھونے نہیں ہیں اور نہ کافی جگہ ہی ہے۔ رات بھر ان کو تکلیف دینے اور خود تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن پرکاش برابر ضد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب راضی ہو گئے۔

بارہ بجے تھے' ٹھاکر صاحب اوپر سو رہے تھے اور پرکاش باہر برآمدہ میں تینوں عورتیں اندر کمرہ میں تھیں۔ پرکاش جاگ رہا تھا۔ ویرو کے سرہانے چابیوں کا گچھا پڑا ہوا تھا۔ پرکاش نے گچھا اٹھا لیا' پھر کمرہ کھول کر اس میں سے زیورات کا ڈبہ نکالا اور ٹھاکر صاحب کے گھر کی طرف چلا۔ کئی ماہ پیشتر وہ اسی طرح لرزتے ہوئے دل کے ساتھ ٹھاکر صاحب کے مکان میں گھسا تھا۔ اس کے پاؤں تب بھی اسی طرح تھر تھرا رہے تھے۔ لیکن تب کانٹا چبھنے کا درد تھا آج کانٹا نکلنے کا۔ تب بخار کا چڑھاؤ تھا حرارت اضطراب اور خلش سے پر' اب بخار کا اتار تھا۔ سکون' فرحت اور امنگ سے بھرا ہوا تب قدم پیچھے ہٹتا تھا۔ آج آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر صاحب کے گھر پہنچ کر اس نے آہستہ سے ویرندر کا کمرہ کھولا اور اندر جا کر ٹھاکر صاحب کے پلنگ کے نیچے ڈبہ رکھ دیا' پھر فوراً" باہر آ کر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور گھر لوٹ پڑا' ہنومان جی سنجیونی بوٹی والا پہاڑ کا ٹکڑا اٹھائے جس روحانی سرور کا لطف اٹھا رہے تھے' ویسی ہی خوشی پرکاش کو بھی ہو رہی تھی۔ زیوروں کو اپنے گھر لے جاتے ہوئے اس کی جان سوکھی ہوئی تھی۔ گویا کہ کسی گہرائی میں گرا جا رہا ہو۔ آج ڈبہ کو لوٹا کر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے وہ ایروپلین پر بیٹھا ہوا فضا میں اڑا جا رہا ہے اوپر اوپر اور اوپر۔

وہ گھر پہنچا تو ویرو سو رہا تھا' چابیوں کا گچھا اس کے سرہانے رکھ دیا۔

ٹھاکر صاحب صبح تشریف لے گئے۔

پرکاش شام کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ آج وہ بے صبر ہو کر تیسرے پہر ہی جا پہنچا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہاں آج کیا گل کھلتا ہے۔

ویرندر نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا۔ "بابو جی کل آپ کے ہاں کی دعوت بڑی مبارک تھی۔ جو زیورات چوری ہو گئے تھے سب مل گئے۔"

ٹھاکر صاحب بھی آ گئے' اور بولے بڑی مبارک دعوت تھی تمہاری' پورا کا پورا ڈبہ مل گیا۔ ایک چیز بھی نہیں گئی' جیسے امانت رکھنے کے لئے ہی لے گیا ہو۔"

پرکاش کو ان کی باتوں پر یقین کیسے آئے جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ چوری کیا ہوا مال چھ ماہ بعد مل جائے اور جوں کا توں۔

ڈبہ کھول کر اس نے بڑی سنجیدگی سے دیکھا' تعجب کی بات ہے۔ میری عقل تو کام نہیں کرتی۔

"ٹھاکر کسی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی بھائی تمہاری ہی کیوں؟ ویرو کی ماں تو کہتی ہے کوئی غیبی معجزہ ہے آج سے مجھے بھی معجزات پر یقین ہو گیا۔"

پرکاش، "اگر آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے یقین نہ آتا۔"

ٹھاکر، "آج اس خوشی میں ہمارے ہاں دعوت ہو گی۔"

پرکاش، "آپ نے کوئی منتر ونتر تو نہیں پڑھوا لیا کسی سے۔"

ٹھاکر، "کئی پنڈتوں سے۔"

پرکاش، "تو بس یہ اسی کی برکت ہے۔"

گھر لوٹ کر پرکاش نے چمپا کو یہ خوشخبری سنائی وہ دوڑ کر ان کے گلے سے چمٹ گئی، اور نہ جانے کیوں رونے لگی، جیسے اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت مدت کے بعد گھر آ گیا ہو۔

پرکاش نے کہا، "آج ان کے ہاں میری دعوت ہے۔"

"میں بھی ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی۔"

"تم تو سینکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو۔"

"مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ لاکھوں روپیہ خرچ کرنے پر بھی ارمان پورا نہ ہو گا۔"

پرکاش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جج اکبر

منشی صابر حسین کی آمدنی کم تھی اور خرچ زیادہ۔ اپنے بچہ کے لئے دایہ رکھنا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ایک تو بچہ کی صحت کی فکر۔ دوسرے برابر والوں سے ہیٹے بن کر رہنے کی ذلت اس خرچ کو برداشت کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ بچہ دایہ کو بہت چاہتا تھا۔ ہر دم اس کے گلے کا ہار بنا رہتا۔ اس وجہ سے دایہ اور بھی ضروری معلوم ہوتی تھی۔ مگر شاید سب سے بڑا سبب یہ تھا۔ کہ وہ مروت کے باعث دایہ کو جواب دینے کی جرات نہ کر سکتے تھے۔ بڑھیا ان کے یہاں تین سال سے نوکر تھی۔ اس نے ان کے اکلوتے بچے کی پرورش کی تھی۔ اپنا کام دل و جان سے کرتی تھی۔ اسے نکالنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اور خواہ مخواہ کھچڑ نکالنا صابر جیسے حلیم شخص کے لئے غیر ممکن تھا۔ مگر شاکرہ اس معاملہ میں اپنے شوہر سے متفق نہ تھی۔ اسے شک تھا۔ کہ دایہ ہم کو لوٹے لیتی ہے۔ جب دایہ بازار سے لوٹتی تو وہ دہلیز میں چھپی رہتی کہ

دیکھوں آٹا چھپا کر تو نہیں رکھ دیتی۔ لکڑی تو نہیں چھپا دیتی۔ اس کی لائی ہوئی چیز کو گھنٹوں دیکھتی۔ پچتاتی۔ بار بار پوچھتی اتنا ہی کیوں؟ کیا بھاؤ ہے؟ کیا اتنا مہنگا ہو گیا؟ دایہ کبھی تو ان بدگمانیوں کا جواب ملائمت سے دیتی۔ لیکن جب بیگم زیادہ تیز ہو جاتیں۔ تو وہ بھی کڑی پڑ جاتی تھی۔ قسمیں کھاتی۔ صفائی کی شہادتیں پیش کرتی تھی۔ تردید اور حجت میں گھنٹوں لگ جاتے۔ قریب قریب روزانہ یہی کیفیت رہتی تھی۔ اور روز یہ ڈرامہ دایہ کی خفیف سی اشک ریزی کے بعد ختم ہو جاتا تھا۔ دایہ کا اتنی سختیاں جھیل کر پڑے رہنا شاکرہ کے شکوک کی آب ریزی کرتا تھا۔ اسے کبھی یقین نہ آتا تھا۔ کہ یہ بڑھیا محض بچے کی محبت سے پڑی ہوئی ہے۔ وہ دایہ کو ایسے لطیف جذبہ کا اہل نہیں سمجھتی تھی۔

اتفاق سے ایک روز دایہ کو بازار سے لوٹنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ وہاں دو کنجڑنوں میں بڑے جوش و خروش سے مناظرہ تھا۔ ان کا مصور طرز ادا۔ ان کا اشتعال انگیز استدلال۔ ان کی مشتعل تضحیک۔ ان کی روشن شہادتیں اور منور روائتیں۔ ان کی تعریض اور تردید سب بے مثال تھیں۔ زہر کے دو دریا تھے یا دو شعلے جو دونوں طرف سے امڈ کر باہم گتھ گئے تھے۔ کیا روانی زبان تھی۔ گویا کوزے میں دریا بھرا ہوا۔ ان کا جوش اظہار ایک دوسرے کے بیانات کو سننے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ان کے الفاظ کی ایسی رنگینی۔ تخیل کی ایسی نوعیت۔ اسلوب کی ایسی جدت۔ مضامین کی ایسی آمد۔ تشبیہات کی ایسی موزونیت اور فکر کی ایسی پرواز پر ایسا کون سا شاعر ہے جو رشک نہ کرتا۔ صفت یہ تھی۔ کہ اس مباحثہ میں تلخی یا دل آزاری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ دونوں بلبلیں اپنے اپنے ترانوں میں محو تھیں۔ ان کی متانت۔ ان کا ضبط۔ ان کا اطمینان قلب حیرت انگیز تھا۔ ان کے ظرف دل میں اس سے کہیں زیادہ کہنے کی اور بدرجہا زیادہ سننے کی گنجائش معلوم ہوتی تھی۔ الغرض یہ خالص دماغی مناظرہ تھا۔ اپنے اپنے کمالات کے اظہار کے لئے ایک خالص زور آزمائی تھی۔ اپنے اپنے کرتب اور فن کے

جوہر دکھانے کے لئے۔

تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ وہ مبتذل کنایات اور اشارے جن پر بے شرمی کو شرم آتی۔ وہ کلمات رکیک جن سے عفونت بھی دور بھاگتی۔ ہزاروں رنگین مزاجوں کے لئے محض باعث تفریح تھے۔ دایہ بھی کھڑی ہو گئی۔ کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے۔ یہ تماشا اتنا دل آویز تھا۔ کہ اسے وقت کا مطلق احساس نہ ہوا۔ یکایک نو بجنے کی آواز کان میں آئی تو سحر ٹوٹا۔ وہ لپکی ہوئی گھر کی طرف چلی۔

شاکرہ بھری بیٹھی تھی۔ دایہ کو دیکھتے ہی تیور بدل کر بولی "کیا بازار میں کھو گئی تھیں؟" دایہ نے خطا وارانہ انداز سے سر جھکا لیا۔ اور بولی۔ "بیوی ایک جان پہچان کی ماما سے ملاقات ہو گئی۔ اور باتیں کرنے لگی۔"

شاکرہ جواب سے اور بھی برہم ہوئی۔ "یہاں دفتر جانے کو دیر ہو رہی ہے۔ تمہیں سیر سپاٹے کی سوجھی ہے۔" مگر دایہ نے اس وقت دبنے میں خیریت سمجھی۔ بچہ کو گود میں لینے چلی۔ پر شاکرہ نے جھڑک کر کہا۔ "رہنے دو۔ تمہارے بغیر بے حال نہیں ہوا جاتا۔"

دایہ نے اس حکم کی تعمیل ضروری نہ سمجھی۔ بیگم صاحبہ کا غصہ فرو کرنے کی اس سے زیادہ کوئی کارگر تدبیر ذہن میں نہ آئی۔ اس نے نصیر کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ دایہ نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اور دروازہ کی طرف چلی۔ لیکن شاکرہ باز کی طرح جھپٹی۔ اور نصیر کو اس کی گود سے چھین کر بولی۔ "تمہارا یہ کمر بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ یہ تماشے کسی اور کو دکھایئے۔ یہاں طبیعت سیر ہو گئی۔"

دایہ نصیر پر جان دیتی تھی۔ اور سمجھتی تھی۔ کہ شاکرہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ اس کی سمجھ میں شاکرہ اور اس کے درمیان یہ ایسا مضبوط تعلق تھا۔ جسے معمولی ترشیاں کمزور نہ کر سکتی تھیں۔ اسی وجہ سے باوجود شاکرہ کی بدزبانیوں کے اسے یقین نہ آتا تھا۔ کہ وہ واقعی مجھے نکالنے پر آمادہ ہے۔ پر شاکرہ نے یہ باتیں کچھ اس بے

رخی سے کیں۔ اور بالخصوص نصیر کو اس بے دردی سے چھین لیا۔ کہ دایہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ بولی۔ "بیوی مجھ سے کوئی ایسی بڑی خطا تو نہیں ہوئی۔ بہت ہو گا تو پاؤ گھنٹہ کی دیر ہوئی ہو گی۔ اس پر آپ اتنا جھلا رہی ہیں۔ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں۔ کہ دوسرا دروازہ دیکھو۔ اللہ نے پیدا کیا ہے۔ تو رزق بھی دے گا۔ مزدوری کا کال تھوڑا ہی ہے۔"

شاکرہ۔ تو یہاں تمہاری کون پروا کرتا ہے۔ تمہاری جیسی مامائیں گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔

دایہ۔ ہاں خدا آپ کو سلامت رکھے۔ مامائیں دائیاں بہت ملیں گی۔ جو کچھ خطا ہوئی ہو۔ معاف کیجئے گا۔ میں جاتی ہوں۔

شاکرہ جا کر مردانے میں اپنی تنخواہ کا حساب کر لو۔

دایہ۔ میری طرف سے نصیر میاں کو اس کی مٹھائیاں منگوا دیجئے گا۔

اتنے میں صابر حسین بھی باہر سے آ گئے۔ پوچھا "کیا ہے؟"

دایہ۔ کچھ نہیں۔ بیوی نے جواب دے دیا ہے۔ گھر جاتی ہوں۔

صابر حسین خانگی تردوات سے یوں بچتے تھے۔ جیسے کوئی برہنہ پا کانٹوں سے بچے۔ انہیں سارے دن ایک ہی جگہ کھڑے رہنا منظور تھا۔ پر کانٹوں میں پیر رکھنے کی جرات نہ تھی۔ چیں بہ جبیں ہو کر بولے۔ "بات کیا ہوئی؟"

شاکرہ۔ کچھ نہیں۔ اپنی طبیعت۔ نہیں جی چاہتا نہیں رکھتے۔ کسی کے ہاتھوں بک تو نہیں گئے۔

صابر۔ تمہیں بیٹھے بٹھائے ایک نہ ایک کھچڑ سوجھتی رہتی ہے۔

شاکرہ۔ ہاں مجھے تو اس بات کا جنون ہے۔ کیا کروں خصلت ہی ایسی ہے۔ تمہیں یہ بہت پیاری ہے تو لے جا کر گلے باندھو۔ میرے یہاں ضرورت نہیں ہے۔

دایہ گھر سے نکلی۔ تو اس کی آنکھیں لبریز تھیں۔ دل نصیر کے لئے تڑپ رہا تھا۔ کہ ایک بار بچے کو گود میں لے کر پیار کر لوں۔ پر یہ حسرت لئے اسے گھر سے نکلنا

پڑا۔

نصیر دایہ کے پیچھے پیچھے دروازہ تک آیا۔ لیکن جب دایہ نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ تو وہ مچل کر زمین پر لوٹ گیا۔ اور انا انا کہہ کر رونے لگا۔ شاکرہ نے چمکارا۔ پیار کیا۔ گود میں لینے کی کوشش کی۔ مٹھائی کا لالچ دیا۔ میلہ دکھانے کا وعدہ کیا۔ اس سے کام نہ چلا تو بندر اور سپاہی اور لولو اور ہوا کی دھمکی دی۔ مگر نصیر پر مطلق اثر نہ ہوا۔ یہاں تک کہ شاکرہ کو غصہ آگیا۔ اس نے بچے کو وہیں چھوڑ دیا۔ اور آکر گھر کے دھندوں میں مصروف ہو گئی۔ نصیر کا منہ اور گال لال ہو گئے۔ آنکھیں سوج گئیں۔ آخر وہیں زمین پر سسکتے سسکتے سو گیا۔

شاکرہ نے سمجھا تھا۔ تھوڑی دیر میں بچہ رو دھو کر چپ ہو جائے گا۔ پر نصیر نے جاگتے ہی پھر انا کی رٹ لگائی۔ تین بجے صابر حسین دفتر سے آئے۔ اور بچے کی یہ حالت دیکھی۔ تو بیوی کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ اور بہلانے لگے۔ آخر نصیر کو جب یقین ہو گیا۔ کہ دایہ مٹھائی لینے گئی ہے۔ تو اسے تسکین ہوئی۔

مگر شام ہوتے ہی اس نے پھر چیخنا شروع کیا۔ "انا مٹھائی لائی؟"

اس طرح دو تین دن گزر گئے۔ نصیر کو انا کی رٹ لگانے اور رونے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ وہ بے ضرر کتا جو ایک لمحہ کے لئے اس کی گود سے جدا نہ ہوتا تھا۔ وہ بے زبان بلی۔ جسے طاق پر بیٹھے دیکھ کر وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ وہ طائر بے پرواز جس پر وہ جان دیتا تھا۔ سب اس کی نظروں سے گر گئے۔ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ انا جیسی جیتی جاگتی پیار کرنے والی۔ گود میں لے کر گھمانے والی۔ تھپک تھپک کر سلانے والی۔ گا گا کر خوش کرنے والی چیز کی جگہ ان بے جان چیزوں سے پر نہ ہو سکتی تھی۔ وہ اکثر سوتے سوتے چونک پڑتا۔ اور انا انا پکار کر ہاتھوں سے اشارہ کرتا۔ گویا اسے بلا رہا ہے۔ انا کی خالی کوٹھری میں جا کر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ اسے

امید ہوتی تھی۔ کہ انا یہاں آتی ہو گی۔ ان کوٹھری کا دروازہ بند پاتا۔ تو جا کر کواڑ کھٹکھٹاتا۔ کہ شاید انا اندر چھپی بیٹھی ہو۔ صدر دروازہ کھلتے سنتا۔ تو انا انا کہہ کر دوڑتا۔ سمجھتا کہ انا آ گئی۔ اس کا گدرایا ہوا بدن گھل گیا۔ گلاب کے سے رخسار سوکھ گئے۔ ماں اور باپ دونوں اس کی موہنی ہنسی کے لئے ترس ترس کر رہ جاتے۔ اگر بہت گدگدانے اور چھیڑنے سے ہنستا بھی۔ تو ایسا معلوم ہوتا۔ دل سے نہیں۔ محض دل رکھنے کے لئے ہنس رہا ہے۔ اسے اب دودھ سے رغبت تھی نہ مصری سے نہ میوہ سے نہ میٹھے بسکٹ سے نہ تازی امرتیوں سے۔ ان میں مزہ تھا۔ جب انا اپنے ہاتھوں سے کھلاتی۔ اب ان میں مزہ نہ تھا۔ دو سال کا ہونہار لہلہاتا ہوا شاداب پودہ مرجھا کر رہ گیا۔ وہ لڑکا جسے گود میں اٹھاتے ہی نرمی گرمی اور وزن کا احساس ہوتا تھا۔ اب استخواں کا ایک پتلا رہ گیا تھا۔ شاکرہ بچہ کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی اور اپنی حماقت پر پچھتاتی۔ صابر حسین جو فطرتاً" خلوت پسند آدمی تھے۔ اب نصیر کو گود سے جدا نہ کرتے تھے۔ اسے روز ہوا کھلانے جاتے۔ نت نئے کھلونے لاتے۔ پر مرجھایا ہوا پودا کسی طرح نہ پنپتا تھا۔ دایہ اس کی دنیا کا آفتاب تھی۔ اس قدرتی حرارت اور روشنی سے محروم ہو کر سبزی کی بہار کیونکر دکھاتا؟ دایہ کے بغیر اب اسے چاروں طرف اندھیرا سناٹا نظر آتا تھا۔ دوسری انا تیسرے ہی دن رکھ لی تھی۔ پر نصیر اس کی صورت دیکھتے ہی منہ چھپا لیتا تھا۔ گویا وہ کوئی دیونی یا بھتنی ہے۔

عالم وجود میں دایہ کو نہ دیکھ کر نصیر اب زیادہ تر عالم خیال میں رہتا۔ وہاں اس کی اپنی انا چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ اس کی وہی گود تھی۔ وہی محبت۔ وہی پیاری باتیں۔ وہی پیارے پیارے گیت۔ وہی مزیدار مٹھائیاں۔ وہی سہانا سنسار۔ وہی دلکش لیل و نہار۔ اکیلے بیٹھے انا سے باتیں کرتا۔ "انا کتا بھونکے' انا گائے دودھ دیتی۔ انا اجلا اجلا گھوڑا دوڑتا۔" سویرا ہوتے ہی لوٹا لے کر دایہ کی کوٹھری میں جاتا اور کہتا۔ "انا پانی پی۔" دودھ کا گلاس لے کر اس کی کوٹھری میں رکھ آتا۔ اور کہتا۔ "انا دودھ پلا۔" اپنی چارپائی پر تکیہ رکھ کر چادر سے ڈھانک دیتا۔ اور کہتا۔ "انا سوتی۔" شاکرہ کھانے

بیٹھتی تو رکابیاں اٹھا اٹھا انا کی کوٹھری میں لے جاتا۔ اور کہتا۔ "انا کھانا کھائے گی۔" انا اس کے لئے اب ایک آسمانی وجود تھی۔ جس کی واپسی کی اسے مطلق امید نہ تھی۔ وہ محض گزشتہ خوشیوں کی دلکش یادگار تھی۔ جس کی یاد ہی اس کا سب کچھ تھی۔ نصیر کے انداز میں رفتہ رفتہ طفلانہ شوخی اور بے تابی کی جگہ ایک حسرت ناک توکل ایک مایوسانہ خوشی نظر آنے لگی۔ اس طرح تین ہفتے گزر گئے۔ برسات کا موسم تھا کبھی شدت کی گرمی۔ کبھی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے۔ بخار اور زکام کا زور تھا۔ نصیر کی نحافت ان موسمی تغیرات کو برداشت نہ کر سکی۔ شاکرہ احتیاطاً اسے فلالین کا کرتا پہنائے رکھتی۔ اسے پانی کے قریب نہ جانے دیتی۔ ننگے پاؤں ایک قدم نہ چلنے دیتی۔ مگر رطوبت کا اثر ہو ہی گیا۔ نصیر کھانسی اور بخار میں مبتلا ہو گیا۔

صبح کا وقت تھا۔ نصیر چارپائی پر آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ ڈاکٹروں کا علاج بے سود ہو رہا تھا۔ شاکرہ چارپائی پر بیٹھی اس کے سینہ پر تیل کی مالش کر رہی تھی۔ اور صابر حسین صورت غم بنے ہوئے بچہ کو پردرد نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس طرف وہ شاکرہ سے بہت کم بولتے تھے۔ انہیں اس سے ایک نفرت سی ہوتی تھی۔ وہ نصیر کی اس بیماری کا سارا الزام اسی کے سر رکھتے تھے وہ ان کی نگاہوں میں نہایت کم ظرف سفلہ مزاج بے حس عورت تھی۔

شاکرہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "آج بڑے حکیم صاحب کو بلا لیتے۔ شاید انہیں کی دوا سے فائدہ ہو۔" صابر حسین نے کالی گھٹاؤں کی طرف دیکھ کر ترشی سے جواب دیا۔ "بڑے حکیم نہیں۔ نعمان بھی آئیں تو اسے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔"

شاکرہ۔ تو کیا اب کسی کی دوا ہی نہ ہو گی؟

صابر۔ بس اس کی ایک ہی دوا ہے۔ اور وہ نایاب ہے۔

شاکرہ۔ تمہیں تو وہی دھن سوار ہے۔ کیا عباسی امرت پلا دے گی؟

صابر۔ ہاں۔ وہ تمہارے لئے چاہے زہر ہو۔ لیکن بچے کے لئے امرت ہی ہو گی۔

شاکرہ۔ میں نہیں سمجھتی۔ کہ اللہ کی مرضی میں اسے اتنا دخل ہے۔

صابر۔ اگر نہیں سمجھتی ہو۔ اور اب تک۔ نہیں سمجھا۔ تو روؤ گی۔ بچے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

شاکرہ۔ چپ بھی رہو۔ کیسا شگون زبان سے نکالتے ہو۔ اگر ایسی جلی کٹی سنانی ہیں۔ تو یہاں سے چلے جاؤ۔

صابر۔ ہاں تو میں جاتا ہوں۔ مگر یاد رکھو یہ خون تمہاری گردن پر ہو گا۔ اگر لڑکے کو پھر تندرست دیکھنا چاہتی ہو تو اس عباسی کے پاس جاؤ۔ اس کی منت کرو۔ التجا کرو۔ تمہارے بچے کی جان اسی کے رحم پر منحصر ہے۔

شاکرہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

صابر حسین نے پوچھا۔ "کیا مرضی ہے۔ جاؤں اسے تلاش کروں؟"

شاکرہ۔ تم کیوں جاؤ گے۔ میں خود چلی جاؤں گی۔

صابر۔ نہیں معاف کرو۔ مجھے تمہارے اوپر اعتبار نہیں ہے۔ نہ جانے تمہارے منہ سے کیا نکل جائے۔ کہ وہ آتی بھی ہو تو نہ آئے۔

شاکرہ نے شوہر کی طرف نگاہ ملامت سے دیکھ کر کہا۔ "ہاں اور کیا۔ مجھے اپنے بچے کی بیماری کا قلق تھوڑے ہی ہے۔ میں نے شرم کے مارے تم سے کہا نہیں۔ لیکن میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ اگر مجھے دایہ کے مکان کا پتہ معلوم ہوتا۔ تو میں اسے کب کی منا لائی ہوتی۔ وہ مجھ سے کتنی ہی ناراض ہو۔ لیکن نصیر سے اسے محبت تھی۔ میں آج ہی اس کے پاس جاؤں گی۔ اس کے قدموں کو آنسوؤں سے تر کروں گی۔ اور وہ جس طرح راضی ہو گی۔ اسے راضی کروں گی۔

شاکرہ نے بہت ضبط کر کے یہ باتیں کہیں۔ مگر امڈے ہوئے آنسو اب نہ رک سکے۔ صابر حسین نے بیوی کی طرف ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا۔ اور نادم ہو کر بولے۔ "میں تمہارا جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں خود ہی جاتا ہوں۔"

عباسی دنیا میں اکیلی تھی۔ کسی زمانے میں اس کا خاندان گلاب کا سرسبز شاداب درخت تھا۔ مگر رفتہ رفتہ خزاں نے سب پتیاں گرا دیں۔ باد حوادث نے درخت، کو پامال کر دیا۔ اور اب یہی ایک سوکھی ٹہنی ہرے بھرے درخت کی یادگار باقی تھی۔

مگر نصیر کو پا کر اس کی سوکھی ٹہنی میں جان سی پڑ گئی تھی۔ اس میں ہری بھری پتیاں نکل آئی تھیں۔ وہ زندگی جو اب تک خشک اور پامال تھی۔ اس میں پھر رنگ و بو کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اندھیرے بیابان میں بھٹکے ہوئے مسافر کو شمع کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ اب اس کا جوئے حیات سنگریزوں سے نہ ٹکراتا تھا۔ وہ اب ایک گلزار کی آبیاری کرتا تھا۔ اب اس کی زندگی مہمل نہیں تھی اس میں معنی پیدا ہو گئے تھے۔

عباسی نصیر کی بھولی بھولی باتوں پر نثار ہو گئی۔ مگر وہ اپنی محبت کو شاکرہ سے چھپاتی تھی۔ اس لئے کہ ماں کے دل میں رشک نہ ہو۔ وہ نصیر کے لئے ماں سے چھپ کر مٹھائیاں لاتی۔ اور اسے کھلا کر خوش ہوتی۔ وہ دن میں دو دو تین تین بار اسے ابٹن ملتی۔ کہ بچہ خوب پروان چڑھے۔ وہ اسے دوسروں کے سامنے کوئی چیز نہ کھلاتی۔ کہ بچے کو نظر نہ لگ جائے۔ ہمیشہ دوسروں سے بچے کی کم خوری کا رونا رویا کرتی۔ اسے نظر بد سے بچانے کے لئے تعویذ اور گنڈے لاتی رہتی۔ یہ اس کی خالص مادرانہ محبت تھی۔ جس میں اپنے روحانی احتراز کے سوا اور کوئی غرض نہ تھی۔

اس گھر سے نکل کر آج عباسی کی وہ حالت ہو گئی جو تھیٹر میں یکایک بجلیوں کے گل ہو جانے سے ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی صورت ناچ رہی تھی۔ کانوں میں وہی پیاری پیاری باتیں گونج رہی تھیں۔ اسے اپنا گھر پھاڑے کھاتا تھا۔ اس کال کوٹھری میں دم گھٹا جاتا تھا۔

رات جوں توں کر کے کٹی۔ صبح کو وہ مکان میں جھاڑو دے رہی تھی۔ یکایک تازے حلوے کی صدا سن کر بے اختیار باہر نکل آئی۔ معاً" یاد آگیا۔ آج حلوا کون کھائے گا؟ آج گود میں بیٹھ کر کون چہکے گا۔ وہ نغمہ مسرت سننے کے لئے جو حلوا کھاتے

وقت نصیر کی آنکھوں سے۔ ہونٹوں سے اور جسم کے ایک ایک عضو سے برستا تھا۔ عباسی کی روح تڑپ اٹھی۔ وہ بے قراری کے عالم میں گھر سے نکلی۔ کہ چلوں نصیر کو دیکھ آؤں۔ پر آدھے راستہ سے لوٹ گئی۔

نصیر عباسی کے دھیان سے ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں اترتا تھا۔ وہ سوتے سوتے چونک پڑتی۔ معلوم ہوتا نصیر ڈنڈے کا گھوڑا دبائے چلا آتا ہے۔ پڑوسنوں کے پاس جاتی تو نصیر ہی کا چرچا کرتی۔ اس کے گھر کوئی آتا۔ تو نصیر ہی کا ذکر کرتی۔ نصیر اس کے دل اور جان میں بسا ہوا تھا۔ شاکرہ کی بے رخی اور بدسلوکی کے ملال کے لئے اس میں جگہ نہ تھی۔

وہ روز ارادہ کرتی کہ آج نصیر کو دیکھنے جاؤں گی۔ اس کے لئے بازار سے کھلونے اور مٹھائیاں لاتی۔ گھر سے چلتی۔ لیکن کبھی آدھے راستہ سے لوٹ آتی۔ کبھی دو چار قدم سے آگے نہ بڑھا جاتا۔ کون منہ لے کر جاؤں۔ جو محبت کو فریب سمجھتا ہو۔ اسے کون منہ دکھاؤں؟ کبھی سوچتی کہیں نصیر مجھے نہ پہچانے تو! بچوں کی محبت کا اعتبار کیا؟ نئی دایہ سے پرچ گیا ہو۔ یہ خیال اس کے پیروں پر زنجیر کا کام کر جاتا تھا۔

اس طرح دو ہفتے گزر گئے۔ عباسی کا دل ہر دم اچاٹ رہتا۔ جیسے اسے کوئی لمبا سفر درپیش ہو۔ گھر کی چیزیں جہاں کی تہاں پڑی رہتیں۔ نہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی۔ بدنی ضروریات بھی خلائے دل کو پر کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ اتفاق سے اسی اثنا میں حج کے دن آ گئے۔ محلہ میں کچھ لوگ حج کی تیاریاں کرنے لگے۔ عباسی کی حالت اس وقت پالتو چڑیا کی سی تھی۔ جو قفس سے نکل کر پھر کسی گوشہ کی تلاش میں ہو۔ اسے اپنے تئیں بھلا دینے کا یہ ایک بہانہ مل گیا۔ آمادہ سفر ہو گئی۔

آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اور ہلکی ہلکی پھواریں پڑ رہی تھیں۔ دہلی اسٹیشن پر زائرین کا ہجوم تھا۔ کچھ گاڑیوں میں بیٹھے تھے۔ کچھ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ چاروں طرف ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ دنیا اس وقت بھی

جانے والوں کے دامن پکڑے ہوئے تھی ۔ کوئی بیوی سے تاکید کر رہا تھا۔ دھان کٹ جائے تو تالاب والے کھیت میں مٹ بو دینا۔ اور باغ کے پاس گیہوں۔ کوئی اپنے جوان لڑکے کو سمجھا رہا تھا۔ اسامیوں پر بقایا لگان کی نالش کرنے میں دیر نہ کرنا۔ اور دو روپیہ سینکڑے سود ضرد۔ مجرا کرا لینا۔ ایک بوڑھے تاجر صاحب اپنے منیم سے کہہ رہے تھے۔ مال آنے میں دیر ہو۔ تو خود چلے جایئے گا۔ اور چلتو مال لیجئے گا۔ ورنہ روپیہ پھنس جائے گا۔ مگر خال خال ایسی صورتیں بھی نظر آتی تھیں جن پر مذہبی ارادت کا جلوہ تھا۔ وہ یا تو خاموش آسمان کی طرف تاکتی تھیں۔ یا محو تسبیح خوانی تھیں۔ عباسی بھی ایک گاڑی میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ ان بھلے آدمیوں کو اب بھی دنیا کی فکر نہیں چھوڑتی۔ وہی خرید و فروخت۔ لین دین کے چرچے۔ نصیر اس وقت یہاں ہوتا تو بہت روتا۔ میری گود سے کسی طرح نہ اترتا۔ لوٹ کر ضرور اسے دیکھنے جاؤں گی۔ گرمی کے مارے کلیجہ بھنا جاتا ہے۔ اتنی گھٹا اٹدی ہوئی ہے۔ برسنے کا نام نہیں لیتی۔ معلوم نہیں یہ ریل والے کیوں دیر کر رہے ہیں۔ جھوٹ موٹ ادھر ادھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ یہ نہیں۔ کہ چٹ پٹ گاڑی کھول دیں۔ مسافروں کی جان میں جان آئے۔ یکایک اس نے صابر حسین کو بائیسکل لئے پلیٹ فارم پر آتے دیکھا۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اور کپڑے تر تھے۔ وہ گاڑیوں میں جھانکنے لگے۔ عباسی محض یہ دکھانے کے لئے کہ میں بھی حج کرنے جا رہی ہوں۔ گاڑی سے باہر نکل آئی۔ صابر حسین اسے دیکھتے ہی لپک کر قریب آئے۔ اور بولے۔ "کیوں عباسی تم بھی حج کو چلیں؟"

عباسی نے فخریہ انکسار سے کہا۔ "ہاں۔ یہاں کیا کروں؟" زندگی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں۔ خدا کے یہاں منہ دکھانے کے لئے بھی تو کوئی سامان چاہئے۔ نصیر میاں تو اچھی طرح ہیں؟"

صابر۔ اب تو تم جا ہی رہی ہو۔ نصیر کا حال پوچھ کر کیا کرو گی۔ اس کے لئے دعا کرتی رہنا۔

عباسی کا سینہ دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر بولی۔ "کیا دشمنوں کی طبیعت اچھی نہیں ہے؟"

صابر۔ اس کی طبیعت تو اسی دن سے خراب ہے۔ جس دن تم وہاں سے نکلیں۔ کوئی دو ہفتہ تک تو شب و روز انا انا کی رٹ لگاتا رہا۔ اور اب ایک ہفتہ سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے۔ ساری دوائیں کر کے ہار گیا۔ کوئی نفع ہی نہیں ہوتا۔ میں نے ارادہ کیا تھا چل کر تمہاری منت سماجت کر کے لے چلوں۔ کیا جانے تمہیں دیکھ کر اس کی طبیعت کچھ سنبھل جائے۔ لیکن تمہارے گھر پر آیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ تم حج کرنے جا رہی ہو۔ اب کس منہ سے چلنے کو کہوں۔ تمہارے ساتھ سلوک ہی کون سا اچھا کیا ہے کہ اتنی جرات کر سکوں۔ اور پھر کار ثواب میں رخنہ ڈالنے کا بھی خیال ہے۔ جاؤ اس کا خدا حافظ ہے۔ حیات باقی ہے۔ تو صحت ہو ہی جائے گی۔ ورنہ مشیت ایزدی سے کیا چارہ؟"

عباسی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سامنے کی چیزیں تیرتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ دل پر ایک عجیب وحشت کا غلبہ ہوا۔ دل سے دعا نکلی۔ "اللہ میری جان کے صدقے میرے نصیر کا بال بیکا نہ ہو۔" رقت سے گلا بھر آیا۔ میں کیسی سنگدل ہوں۔ پیارا بچہ رو رو کر ہلکان ہو گیا۔ اور میں اسے دیکھنے تک نہ گئی۔ شاکرہ بدمزاج سہی۔ بدزبان سہی۔ نصیر نے میرا کیا بگاڑا تھا؟ میں نے ماں کا بدلہ نصیر سے لیا۔ یا خدا میرا گناہ بخشیو۔ پیارا نصیر میرے لئے ہڑک رہا ہے۔ (اس خیال سے عباسی کا کلیجہ مسوس اٹھا۔ اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے) مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ اسے مجھ سے اتنی محبت ہے۔ ورنہ شاکرہ کی جوتیاں کھاتی۔ اور گھر سے قدم نہ نکالتی۔ آہ! نہ معلوم بچارے کی کیا حالت ہے۔ انداز وحشت سے بولی۔ "دودھ تو پیتے ہیں نا۔؟"

صابر۔ تم دودھ پینے کو کہتی ہو۔ اس نے دو دن سے آنکھیں تک تو کھولیں نہیں۔

عباسی۔ یا میرے اللہ۔ ارے او قلی قلی! بیٹا آ کے میرا اسباب گاڑی سے اتار دے۔ اب مجھے حج وج کی نہیں سوجھتی۔ ہاں بیٹا ذرا جلدی کر۔ میاں دیکھئے۔ کوئی یکہ

ہو تو ٹھیک کر لیجئے۔

یکہ روانہ ہوا۔ سامنے سڑک پر کئی بگھیاں کھڑی تھیں۔ گھوڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ عباسی بار بار جھنجھلاتی تھی۔ اور یکہ بان سے کہتی تھی۔ "بیٹا جلدی کر۔ میں تجھے کچھ زیادہ دے دوں گی۔" راستے میں مسافروں کی بھیڑ دیکھ کر اسے غصہ آتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ گھوڑے کے پر لگ جاتے۔ لیکن جب صابر حسین کا مکان قریب آ گیا۔ تو عباسی کا سینہ زور سے اچھلنے لگا۔ بار بار دل سے دعا نکلنے لگی۔ خدا کرے سب خیرو عافیت ہو۔

یکہ صابر حسین کی گلی میں داخل ہوا۔ دفعتاً" عباسی کے کان میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ سر تیورا گیا۔ معلوم ہوا دریا میں ڈوبی جاتی ہوں۔ جی چاہا یکہ سے کود پڑوں۔ مگر ذرا دیر میں معلوم ہوا۔ کہ عورت میکہ سے بدا ہو رہی ہے۔ تسکین ہوئی۔

آخر صابر حسین کا مکان آ پہنچا۔ عباسی نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف تاکا۔ جیسے کوئی گھر سے بھاگا ہوا یتیم لڑکا شام کو بھوکا پیاسا گھر آئے۔ اور دروازے کی طرف سہمی ہوئی نگاہ سے دیکھے کہ کوئی بیٹھا تو نہیں ہے۔ دروازے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ باورچی بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ عباسی کو ذرا ڈھارس ہوئی۔ گھر میں داخل ہوئی۔ تو دیکھا کہ نئی دایہ بیٹھی پولٹس پکا رہی ہے۔ کلیجہ مضبوط ہوا۔ شاکرہ کے کمرے میں گئی۔ تو اس کا دل گرما کی دوپہری دھوپ کی طرح کانپ رہا تھا۔ شاکرہ نصیر کو گود میں لئے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی۔ غم اور یاس کی زندہ تصویر۔

عباسی نے شاکرہ سے کچھ نہیں پوچھا۔ نصیر کو اس کی گود سے لے لیا۔ اور اس کے منہ کی طرف چشم پرنم سے دیکھ کر کہا۔ "بیٹا نصیر آنکھیں کھولو۔"

نصیر نے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحہ تک دایہ کو خاموش دیکھتا رہا۔ تب یکایک دایہ کے گلے سے لپٹ گیا۔ اور بولا "انا آئی۔ انا آئی۔"

نصیر کا زرد مرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا۔ جیسے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل پڑ

جائے۔ ایسا معلوم ہوا۔ گویا وہ کچھ بڑھ گیا ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ نصیر آنگن میں کھیل رہا تھا۔ صابر حسین نے آکر اسے گود میں اٹھا لیا۔ اور پیار کر کے بولے۔ "تمہاری انا کو مار کر بھگا دیں۔"

نصیر نے منہ بنا کر کہا۔ "نہیں روئے گی۔"

عباسی بولی۔ "کیوں بیٹا۔ مجھے تو تو نے کعبہ شریف نہ جانے دیا۔ میرے حج کا ثواب کون دے گا؟"

صابر حسین نے مسکرا کر کہا۔ "تمہیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہو گیا۔ اس حج کا نام حج اکبر ہے۔"

کفن

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا درد زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی۔ فضا سناٹے میں غرق' سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا جا دیکھ تو آ۔"

مادھو درد ناک لہجے میں بولا۔ "مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا آؤں۔"

"تو بڑا بے درد ہے بے سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بے وپھائی۔"

"تو مجھ سے اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ پھر چلم پیتا۔ اس لئے انہیں کوئی رکھتا ہی نہ تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج ہو تو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا۔ جب تک وہ پیسے رہتے دونوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آ جاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکل کے لئے ضبط نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی۔ ان لوگوں کے گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے' دنیا کے فکروں سے آزاد' قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے تھے۔ مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور راتوں کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود کر لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا۔ مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی پسائی کر کے' گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا بھی انتظام کر لیتی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے درد زہ

سے مر رہی تھی۔ اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مرجائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا۔ "جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی چڑیل کا پھنساؤ ہو گا اور کیا۔ یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے؟"

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ بولا۔ "مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا ہے؟ میں تو یہاں ہوں ہی۔"

"تو تم ہی جا کر دیکھو نا۔"

"میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں۔ کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا' آج اس کا اگھرا ہوا بدن دیکھوں اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہو گی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔"

"میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ سونٹھ 'گڑ' تیل کچھ تو نہیں ہے گھر میں۔"

"سب کچھ آئے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو۔ جو لوگ ابھی پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے۔ گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔"

جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے۔ وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے کہ گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا اور کسانوں کی سی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و ادب کی پابندی بھی

کرتا۔ اس لئے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں کچھ ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا تھا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور تالو اور حلق کو جلا دیتا تھا۔ اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھا اسی لئے دونوں جلدی جلدی نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی بارات یاد آئی۔ جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا "وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں۔ سب کو چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی ٹپکنی' رائتہ' تین طرح کے سوکھے ساگ' ایک رسے دار ترکاری' دہی' چٹنی' مٹھائی اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے تو ایسا کھایا ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی کچوریاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہئے پتل کو ہاتھ سے روکے ہوئے تھے مگر وہ ہیں کہ دئے جاتے ہیں۔ اور جب سب نے منہ دھو لیا تو ایک ایک بڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدھ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا۔ چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا کہ "اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔"

"اب کوئی کیا کھلائے گا۔ وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے۔ سادی بیاہ میں مت کھرچ کرو۔ کریا کم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے۔"

"تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی۔"

"بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔"

"میں پچاس کھا جاتا۔"

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے"

(آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے تھے۔ جیسے دو بڑے اژدر کنڈلیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔)

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس گیا پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ و زاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقعہ نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اسی طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں مانس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمینداروں کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انہیں اپنے ہاتھوں سے پیٹ چکے تھے۔ چوری کی علت

میں' وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علت میں۔ پوچھا "کیا ہے بے گھیسوا۔ روتا کیوں ہے؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔"

گھیسوا نے زمین پر سر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ "سرکار بڑی بپت میں ہوں۔ مادھو کی گھر والی رات گجر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی۔ آدمی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا۔ مگر وہ ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا۔ مالک تباہ ہو گئے۔ گھر اجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں۔ اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا سب دوا دارو میں اٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہو گی تو اس کی مٹی اٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں"؟

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں چل دور ہو یہاں سے لاش گھر میں رکھ سڑا۔ یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آکر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا۔ بدمعاش۔ مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقعہ نہیں تھا۔ طوعاً" و کرہاً" دو روپے نکال کر پھینک دئے۔ مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دئے تو گاؤں کے بنئے مہاجنوں کو انکار کی جرات کیوں کر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام سے ڈھنڈورا پیٹتا جاتا تھا۔ کسی نے دو آنے دئے کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلہ دیا اور کسی نے لکڑی' اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے۔ ادھر لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش آ آکر دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا۔ "لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے کیوں مادھو۔؟"

مادھو بالا "ہاں لکڑی تو بہت ہے اب کپھن چاہئے۔"

"تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں۔"

"ہاں اور کیا لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کپھن کون دیکھتا ہے۔"

"کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہئے۔"

" کپھن لاس کے ساتھ جل تو جاتا ہے۔"

"اور کیا رکھا ہے یہی پانچ روپیہ ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔"

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آپہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے اور ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر(گھیسو نے ایک بوتل شراب کی لی۔ کچھ گزک اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔)

کئی کجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آگئے۔

گھیسو بولا۔ " کپھن لگانے سے کیا ملتا جل ہی تو جاتا کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔"

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔

"دنیا کا دستور ہے۔ یہیں لوگ بامنوں کو ہجاروں کیوں دیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے پر لوک میں ملتا ہے کہ نہیں۔

"بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے۔"

"لیکن لوگوں کو جواب کیا دیں گے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کپھن کہاں ہے۔؟"

گھیسو ہنسا "کہہ دیں گے کہ روپے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔"

مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا۔

"بڑی اچھی تھی بچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔"

(آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہو گئی گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں۔ گوشت اور سالن اور چٹ پٹ کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی سادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے تھے۔

(دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔) نہ جواب دہی کا خوف تھا۔ نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔ "ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پن نہ ہو گا۔"

مادھو نے فرق عقیدت جھکا کر تصدیق کی "جرور سے جرور ہو گا۔ بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔")

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔

"کیوں داد! ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی۔"

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پر ملامت انداز سے دیکھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟"

"کہیں گے تمہارا سر۔"

"پوچھے گی تو جرور۔"

"تو کیسے جانتا ہے کہ اسے کفن نہ ملے گا تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال کیا دنیا میں گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کفن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔"

مادھو کو یقین نہ آیا بولا۔ "کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دئے۔"

گھیسو تیز ہو گیا۔ "میں کہتا ہوں اسے کچھن ملے گا تو مانتا کیوں نہیں۔"

"کون دے گا۔ بتاتے کیوں نہیں۔"

"وہی لوگ دیں گے جنہوں نے اب کی دیا ہاں وہ روپیہ ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آ جائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کچھن تیسری بار ملے گا۔"

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی مے خانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا' کوئی کہکتا تھا' کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا۔ کوئی اپنے دوست کے منہ سے ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا ہوا میں نشہ' کتنے تو چلو میں الو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آئے تھے صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لئے شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی اور کچھ دیر کے لئے وہ بھول جاتے تھے۔ کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں یا زندہ درگور۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزا لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا۔ جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور "پینے" کے غرور' ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا۔ "لے جا کھوب کھا اور اسیرباد دے جس کی کمائی تھی وہ تو مر گئی مگر تیرا اسیرباد اسے جرور پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے اسیرباد دے۔ بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔"

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بیکنٹھ میں جائے گی دادا۔ بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔"

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ "ہاں بیٹا بیکنٹھ میں

(جائے گی کسی کو ستایا نہیں کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لئے گنگا میں جاتے ہیں۔ اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔")

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بدلا۔ تکون نشے کی خاصیت ہے یاس اور غم کا دورہ ہوا۔

مادھو بولا۔ "مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا مری بھی تو کتنا دکھ جھیل کر۔

وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا۔ "کیوں روتا ہے بیٹا کھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دئے۔"

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔

ٹھگنی کیوں نیناں جھمکاوے ٹھگنی

سارا مے خانہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں مے کش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اچھلے بھی، کودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی، بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کی اہم مطبوعات

ادب و تنقید

تاریخ ادب اردو (آغاز سے اٹھارہویں صدی تک) (تین جلدوں پر مشتمل)	جمیل جالبی
مثنوی کدم راؤ، پدم راؤ	جمیل جالبی
ارسطو سے ایلیٹ تک	جمیل جالبی
نئی تنقید	جمیل جالبی
ادب، کلچر اور مسائل	جمیل جالبی
محمد تقی میر	جمیل جالبی
ایلیٹ کے مضامین	جمیل جالبی
معاصر ادب	جمیل جالبی
ادبی تحقیق	جمیل جالبی
میر تقی ایک مطالعہ	جمیل جالبی
تنقید و تجربہ	جمیل جالبی
قومی ڈکشنری (انگلش - اردو)	جمیل جالبی
بوطیقا (تصنیف ارسطو) ترجمہ	جمیل جالبی
ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ	گوہر نوشاہی
شاہ عالم ثانی آفتاب احوال و ادبی خدمات	ڈاکٹر خاور جمیل
ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات	گوپی چند نارنگ
اردو افسانہ روایت اور مسائل	گوپی چند نارنگ
گوپی چند نارنگ - حیات و خدمات	ڈاکٹر سید حامد علی
ادبی تنقید اور اسلوبیات	گوپی چند نارنگ
اقبال کا فن	گوپی چند نارنگ
امیر خسرو کا ہندوی کلام	گوپی چند نارنگ
انیس شناسی	گوپی چند نارنگ
اسلوبیات میر	گوپی چند نارنگ
سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ	گوپی چند نارنگ
سفر آشنا	محمود واجد
لمحہ لمحہ زندگی	
دامان باغباں	قرۃ العین حیدر
اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے	فرمان فتح پوری
اردو نثر کا فنی ارتقاء	فرمان فتح پوری
اردو شاعری کا فنی ارتقاء	فرمان فتح پوری
اقبال سب کے لئے	فرمان فتح پوری
تاریخ ادبیات عالم (پانچ جلدیں)	وہاب اشرفی
قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ	وہاب اشرفی
معنی کی تلاش	وہاب اشرفی
آگہی کا منظر نامہ	وہاب اشرفی
راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری	وہاب اشرفی
کاشف الحقائق	وہاب اشرفی
شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری	وہاب اشرفی
حرف حرف آشنا	وہاب اشرفی
اردو فکشن اور تیسری آنکھ	وہاب اشرفی
تفہیم البلاغت	وہاب اشرفی
ہندوستانی محاورے	محمد حسن
ہندوستانی شاعری	محمد حسن
ہندی ادب کی تاریخ	محمد حسن
ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر	قمر رئیس
تعبیر و تحلیل	قمر رئیس
اصول تحقیق و ترتیب متن	تنویر احمد علوی
ابتدائی کلام اقبال	گیان چند جین
کھوج	گیان چند جین
پرکھ اور پہچان	گیان چند جین
قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن	گیان چند جین
اوپندر ناتھ اشک	گیان چند جین
کرشن چندر کی ناول نگاری	ڈاکٹر اعجاز علی ارشد
اخترالایمان مقام اور کلام	ڈاکٹر محمد فیروز

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, VAKIL STREET, KUCHA PANDIT, LAL KAUN, DELHI-6 (INDIA)

PH: 23216162, 23214465 FAX: 011-23211540

E-MAIL: ephdelhi@yahoo.com

81-87667-74-5

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب

کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو

جوائن کریں

ایڈمن پینل :

محمد ثاقب ریاض: 03447227224

سدرہ طاہر: 03340120123

حسنین سیالوی: 03056406067

Imagitor